پاکستانی غزل
دور کے رویے اور رجحانات
معین الدین عقیل
ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان
کراچی

## تشکیلی دور کے رویّے اور رُجحانات

مُعین الدّین عقیل

ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان
کراچی

| | | |
|---|---|---|
| تصنیف | : | پاکستانی غزل: تشکیلی دور کے رویے اور رجحانات |
| مصنف | : | ڈاکٹر معین الدین عقیل |
| ناشر | : | ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پاکستان ۔ کراچی |
| طابع | : | المخزن پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی |
| کتابت | : | بقا کمپوزنگ سروسز، اردو بازار، کراچی |
| اشاعت | : | ۱۹۹۷ء (اول) |
| قیمت | : | ...... روپے |

ملنے کے پتا

**مکتبۂ شاہد**

۱/۹، علی گڑھ کالونی

کراچی ۷۵۸۰۰

# انتساب

میں اپنی یہ ادبی تنقیدی کاوش

**محترم مشفق خواجہ**

کے نام معنون کرتا ہوں

عقیل

# فہرستِ موضوعات

# معروضہ

متنوع ادبی اصناف کے مقابلے میں غزل اب بھی ہمارے ادب کی مقبول ترین صنف ہے اور پاکستانی دور میں فی الحقیقت اس نے فراز کی جانب تو سفر کیا ہے، نشیب کا راستہ بہت کم دیکھا ہے۔ پھر اسے یہاں اتنی توانا صنف کی حیثیت حاصل رہی ہے کہ اس میں فرد اور معاشرہ...... دونوں، اپنے کل فکر و احساس کے ساتھ بھرپور صورت میں سامنے آتے رہے ہیں اور یہ ان کے رویوں اور رجحانات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی ان کے تابع رکھتی رہی ہے۔

پاکستانی غزل کے رویوں اور رجحانات کے مطالعے کی زیرِ نظر کوشش اس دور کا احاطہ کرتی ہے، جو کم و بیش تین دہائیوں پر محیط ہے...... اور جو کئی اعتبار سے ہمارے مجموعی ادبی رویوں اور رجحانات کی تشکیل کا دور بھی ہے۔

یہ مطالعہ قریباً پندرہ برس قبل لکھا گیا اور اسے بھارت میں ڈاکٹر احمد سجاد صاحب (پروفیسر، رانچی یونیورسٹی) نے شائع فرمایا تھا، لیکن بہت جلد اس کی کمیابی اور پاکستان میں یکسر عدم دستیابی کے باعث اب کراچی سے میرے کرم فرما ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری صاحب کی توجہ اور زحمتوں کے نتیجے میں دوبارہ، کسی ترمیم یا تبدیلی کے بغیر شائع ہو رہا ہے۔

عقیل

ٹوکیو۔ فروری ۱۹۹۷ء

# باب اول

# پاکستانی غزل

## تقسیم ہند کے آس پاس

# پاکستانی غزل

## تقسیم ہند کے آس پاس

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے غزل متعدد ادوار اور بے شمار تغیرات سے گزری ہے۔ یہ ہماری شاعری کی مقبول ترین صنف ہے اور کئی صدیوں سے اس کی روح رواں بنی ہوئی ہے۔ گو موجودہ دور میں اردو شاعری نے "تنگنائے غزل" کی حدود سے تجاوز کر کے اظہار و بیان کی کئی صورتیں (نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم وغیرہ) اختیار کی ہیں، لیکن ان تمام توسیعی ذرائع کے باوجود غزل کی مقبولیت میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے اس میں ایسی فطری لچک موجود ہے کہ یہ اپنے اصل مزاج اور بنیادی ہیئت و ترکیب کو برقرار رکھتے ہوئے ہر دور کے نئے تقاضوں میں نہایت آسانی کے ساتھ ڈھل جاتی ہے اور ہر عہد کے مزاج کی حقیقی ترجمانی کرتی ہے۔ قدیم دکنی شاعروں کے زمانے سے لے کر غالب کے زمانے تک یہ ہماری شاعری کی سب سے مقبول و ہر دل عزیز صنف رہی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب سیاسی اور معاشرتی انقلابات رونما ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ جدید تصورات کی یلغار ہوئی تو رفتہ رفتہ یہ احساس عام ہوتا گیا کہ شعر و ادب میں زندگی کے خارجی کوائف اور ٹھوس مادی حقائق کو

اصل اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ اسی احساس نے اگر ایک طرف اردو نظم کی بنیاد استوار کی تو دوسری طرف حالی کے ذریعے غزل کی تنقید اور اصلاح کا آغاز کیا۔ حالی نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کے رسمی و تقلیدی عناصر اور فرسودہ و روایتی پہلوؤں کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس وقت ہماری شاعری کو یقیناً حالی جیسے معتدل اور متوازن مزاج مصلح اور ناقد کی ضرورت تھی۔ ان کی اصلاحی کوششوں سے ہماری شاعری کو واقعتاً بہت فائدہ پہنچا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ نظم کی ترقی کے ساتھ ساتھ غزل نے بھی اپنے جمود کو توڑ کر کچھ قدم آگے بڑھائے۔ تاثیر اور افادیت کے لحاظ سے اس کا معیار پہلے سے اونچا ہو گیا۔ غزل کے اس احیا کے دو پہلو نمایاں ہیں، ایک طرف تو ادب و فن کے ایک صحت مند تصور کے تحت بعض قدیم اساتذہ مثلاً میر، سودا، مصحفی، آتش، مومن اور غالب کی قدریں دوبارہ متعین کی گئیں اور دوسری طرف حسرت، فانی، اصغر، یگانہ اور اقبال نے غزل میں ایک نئی معنویت اور ایک نئی وسعت پیدا کر کے اسے بیسویں صدی کے مزاج کا ترجمان بنا دیا۔ "مقدمہ شعر و شاعری" کی اشاعت (۱۸۹۳ء) کے بعد تقریباً چالیس سال تک غزل کی تجدید و احیا کا یہ کام جاری رہا۔ اس دوران عظمت اللہ خاں اور وحید الدین سلیم کی سرسری تنقید کے علاوہ حالی کی طرح غزل پر کوئی بھرپور تنقید نہیں ہوئی۔ لیکن ۱۹۳۵ء کے آس پاس تنقید اور اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ کافی طویل اور متنوع ثابت ہوا۔

اولاً جوش ملیح آبادی نے غزل کی موضوعی بے ربطی کو اپنی مخالفت کا

نشانہ بنایا۔ انھوں نے مسلسل اور مربوط غزل کی حمایت کی اور کثیر تعداد میں مسلسل غزلیں لکھیں۔ یہ مسلسل غزلیں جوش کے وسعتِ تخیل کے اچھے شعری کارنامے تھے، لیکن اس طرح غزل نظم سے قریب ہو گئی۔ اعتراضات کے اس سلسلے کی دوسری کڑی عندلیب شادانی کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے ۱۹۳۷ء میں لکھنے شروع کیے۔ ان مضامین میں شادانی نے بھی غزل کے رسمی و تقلیدی عناصر کے خلاف تنقیدی رویہ اختیار کیا۔ پھر پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" میں غزل پر جو اعتراضات کیے وہ بھی اس نئے سلسلۂ اعتراضات کی ایک کڑی خیال کیے جاسکتے ہیں۔ ان اعتراضات میں انھوں نے بھی غزل پر بے ربطی اور عدم تسلسل کا اعتراض کیا اور اسے "ایک نیم وحشی صنفِ سخن" قرار دیا۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ترقی پسندوں نے غزل کی خارجی ہیئت پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا لیکن اس صنف سے ان کا مطالبہ یہ رہا کہ غزل کو دوسری اصنافِ سخن کی طرح سماجی ماحول کی شعوری طور پر عکاسی کرنی چاہیے اور اسے اپنے دور کی اجتماعی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ آزاد نظم اور نظم معریٰ کا عروج ہوا۔ اس زمانے میں غزل ترقی پسندوں کے شدید اعتراضات کا نشانہ بنی، لیکن بہرحال اب یہ تسلیم کیا جانے لگا کہ غزل شاعری کی دوسری اصناف کے دوش بدوش سماجی زندگی کے ٹھوس حقائق اور جدید رجحانات کی حامل بن سکتی ہے اور اس میں نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی پوری

صلاحیت موجود ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب حالات میں قدرے ٹھہراؤ آگیا تو شعر کے موضوعی امکانات اور ہیئت کے مسائل کے بارے میں غور و فکر کا پھر آغاز ہوا اور غزل کچھ عرصے تک ترقی پسند شاعروں کے ہاتھوں وضاحت اور مقصدیت کے تابع ہو کر اپنا تخلیقی جوہر مجروح کرتی رہی۔ اقبال کے بعد، جنھوں نے اسے نظم کا آہنگ دے کر اس کی فطری مطابقت کو نمایاں کیا تھا، تقسیم ہند کے بعد تک جو غزل وجود میں آئی وہ مجموعی طور پر کسی نئی جہت کا اضافہ نہ کر سکی۔ گو اس وقت اس کے ممتاز لکھنے والوں میں جگر، فراق اور فیض جیسے شاعر موجود تھے، لیکن جگر کی عشقیہ کیفیات عصری تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں۔ فراق موجودہ صدی کے بحرانی حالات کا سامنا کرنے کے باوجود ایک محدود رومانی دائرے میں محصور رہے، اس لیے ان کی غزلیں جذبہ اور غم کی کیفیات سے آزاد نہ ہو سکیں اور فیض نے غزل کے روایتی اسلوب کو کیف و نکھار تو ضرور دیا لیکن ان کی فکری تنگ دامانی کے سبب غزل فکر انگیزی سے محروم رہی۔

اس دور میں غزل کے چند اور نامور شعرا موجود تھے، لیکن وہ غزل کے تخلیقی مزاج کو تمام و کمال اخذ نہ کر سکے۔ دراصل اس دور کے بیشتر شعرا مکمل طور پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا احاطہ نہیں کر سکے ہیں۔ وہ نئے حالات کا سامنا کرنے کے باوجود روایت کا بارِ گراں اٹھائے رہے اور ان کی غزل چند مخصوص موضوعات اور رسائل کے گرد گھومتی رہی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان اور بھارت دونوں ممالک میں غزل کا احیا ہوا لیکن اس کی ہیئت اور اس کے مزاج

میں فوری طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

تقسیم ہند نے جس طرح پاکستان اور بھارت کے درمیان جغرافیائی اور نظریاتی لحاظ سے ایک خط فاصل کھینچا تھا، اسی طرح اس نے اردو کی لسانی، ادبی اور فکری تاریخ کو بھی دو علاحدہ علاحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی ادبی اور فکری سطح پر جو میلانات اور رجحانات "نیا ادب" اور "ترقی پسند ادب" کی صورت میں کچھ عرصہ قبل سے مقبول ہوئے تھے، تقسیم ہند نے ان کے رخ اور مزاج بدل ڈالے۔ اب نئے ماحول میں ان کے بارے میں کہیں انکار اور کہیں تشکیک کی فضا پیدا ہوئی۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک کا عہد بڑے ہی انتشار، پریشانی اور بحران کا دور رہا اور اس کا عکس ادب میں بھی نمایاں ہو کر رہا۔ آزادی، تقسیم، فسادات اور ہجرت کے واقعات ۱۹۴۷ء کے آس پاس ایک ساتھ رونما ہوئے۔ برعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں ایسا دور کم ہی نظر آیا جب چند سالوں کے عرصے میں ایک ساتھ اتنے بڑے سیاسی، معاشرتی اور ذہنی انقلابات واقع ہوئے ہوں۔ چناں چہ ان لوگوں نے، جنھوں نے ان حادثات کو قریب سے محسوس کیا تھا، جب ادب تخلیق کیا تو ان کا ذہنی انتشار اور روحانی کرب ان کی تحریروں میں بھی جھلکا۔ چناں چہ ادب کی تمام اصناف میں یہ کرب اور المیہ "فسادات" کے ایک عام موضوع کی صورت میں نظر آتا ہے۔

اس دوران ایک اہم کیفیت تو یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ذہن و احساس کا رخ اجتماعی مسائل سے ہٹ کر، جو نئے اور ترقی پسند ادب کے زیر اثر ادب میں بہت نمایاں اور مقبول ہو گئے تھے، انفرادی مسائل اور فرد کے احترام کی

طرف پھر جاتا ہے ۔ اور دوسری جانب تقسیم کے بعد کے حالات و واقعات بالخصوص شاعری میں داخلی تجربات و احساسات کی صورت میں ممنودار ہوئے یہی وجہ ہے کہ فسادات کے احساس و تاثر پر کئی اچھی نظمیں اور غزلیں لکھی گئیں ۔ شاعروں نے زیادہ تر اپنی ذات اور داخلی جذبات و احساست کو موضوع بنایا ۔ اس دور میں ان کے کلام میں تنہائی، افسردگی، مایوسی، خود کلامی اور ابہام بہت زیادہ ہے ۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ماحول کا انتشار اور بیشتر شعرا کے ہاں کسی واضح نصب العین یا مقصدِ حیات کا فقدان ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کے خاص خاص موضوعات کی پیش کش کم ہو جاتی ہے ۔ مثلاً معاشی اور سیاسی انقلاب کی دعوت پہلے سے کم نظر آتی ہے، سیاست اور شاعری کے روابط کمزور معلوم ہوتے ہیں اور معاشی عوامل اپنی اہمیت کم کر لیتے ہیں ۔ نئے شعرا شاعری کی قدیم روایات سے پہلے سے زیادہ دل چسپی لینے لگتے ہیں ۔ حالات سے سمجھوتے کا رویہ اس دور کا غالب رجحان بن جاتا ہے ۔ نئے اسالیب اور ہیئت کے لیے تجربات بھی اگرچہ برابر جاری رہتے ہیں، مگر پرانے اسالیب سے استفادے کا رجحان پھر زیادہ ہو جاتا ہے ۔ غزل کے اسلوب میں اگرچہ برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مگر اس کی بنیادی حیثیت میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا ۔ یہ امر توجہ کے لائق ہے کہ اس دور میں غزل کے پرانے اسالیب کے مطالعے سے نئے اسالیب تلاش کرنے کی جو کوشش ہوئی اس کے پس پشت غزل کی پوری روایت شاعروں کے پیش نظر رہی، جس کی بنیاد پر نئی غزل کی خصوصیات استوار ہوئیں ۔ اس رجحان کی

ایک مثال تقلید میر ہے ۔ یہ رجحان اس وقت محض اثر انگیزی کی ایک کوشش نہیں بلکہ عہد کا تقاضہ تھا ۔ اسی رجحان نے بعض نئے شاعروں کی انفرادیت کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ۔ اس طرز کو سب سے زیادہ جن شاعروں نے اختیار کیا ان میں ناصر کاظمی، مختار صدیقی اور ابن انشا کو امتیاز حاصل ہوا ۔ اس میں ان کے ساتھ ساتھ شہرت بخاری، اطہر نفیس، قیوم نظر، مشفق خواجہ اور سیف الدین سیف وغیرہ کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں، لیکن ان میں سے بعض نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا یا بعض نے کچھ بعد میں اس طرز کو اختیار کیا ۔ ان کے علاوہ اس طرز میں اور بھی متعدد شعرا نے طبع آزمائی کی، مگر ان میں سے بیشتر نے محض میر کی داخلیت کی سطحی نقالی کی ۔ اسی طرح غالب کے انداز کو نئی زبان اور نئے تجربات میں جذب کرنے کا میلان بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے ۔ ایسے شعرا میں باقی صدیقی اور فضل احمد کریم فضلی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں ۔ اسی طرح فیض احمد فیض کے کلام میں سودا اور ذوق وغیرہ کے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں ۔ ان شاعروں کی انفرادیت نئی علامتوں اور نئے طرزِ اظہار کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب کے خمیر ہی سے پیدا ہوئی ہے ۔ کلاسیکی قدروں کی اس تقلید نے دراصل غزل کی احیاے نو کا کام بھی انجام دیا ۔

اس دور کے ایک بڑے حصہ میں غزل گو شاعروں کا پرانا گروہ بھی بدستور غزل گوئی میں مصروف رہا ۔ ان میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، سیماب اکبر آبادی، بہزاد لکھنوی، جلیل قدوائی، فیض احمد

ندیم قاسمی، آل رضا، حفیظ ہوشیارپوری، صوفی تبسم، فضلی، عبدالحمید عدم اور عابد علی عابد نے اپنے اپنے انداز میں غزلیں لکھیں۔ مگر ان پرانے اور نئے شعرا میں جن لوگوں کی غزل میں بالکل نئی وسعتوں کی طرف بڑھنے کا رجحان ملتا ہے، ان کو صرف چند ناموں تک محدود کیا جاسکتا ہے۔ یہ فیض، ناصر کاظمی، باقی صدیقی، حفیظ ہوشیارپوری، صوفی تبسم اور احمد ندیم قاسمی ہیں۔ ان شاعروں نے غزل میں ایک نئی جان ڈالنے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ جو نام بعد میں اضافہ کیے جاسکتے ہیں ان میں عزیز حامد مدنی، شان الحق حقی، شہرت بخاری، قتیل شفائی، یوسف ظفر، مصطفیٰ زیدی، ماہرالقادری، رئیس امروہوی وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر شاعروں نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق اچھی غزلوں کا اضافہ کیا۔

فیض اپنے معاصر شاعروں میں بجا طور پر آگے رہے ہیں۔ ان کی اور ناصر کاظمی، باقی صدیقی اور حفیظ ہوشیارپوری کی غزلوں کو ابتدائی پاکستانی دور کی بہترین غزلوں میں نمائندگی دی جاسکتی ہے۔ ان شعرا نے غزل کی روایت اور اس کے حسن میں قابل قدر اضافے کیے ہیں اور ناصر کاظمی، ابن انشا اور باقی صدیقی نے اس کے لہجہ میں ایک نئی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان شاعروں نے غزل کو لفاظی، بلند آہنگی، وضاحت اور تکرار سے حتی الامکان نجات دلا کر اسے داخلی آہنگ، سادگی، تاثیر اور گہرائی سے آشنا کیا۔ اظہار و بیان کے لیے ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق انفرادی اسلوب کی تلاش کی۔ انھیں اپنے اظہار و بیان کے لیے نت نئے موضوعات کی بھی جستجو رہی۔ نئی

قدروں کی تلاش کے اس دور میں، جب کہ پرانی قدریں زوال پذیر تھیں اور نئی قدریں آہستہ آہستہ تشکیل پا رہی تھیں، ایک اہم بات یہ ہوئی کہ غزل جو کچھ عرصہ پہلے اپنی جگہ نظم کو دے رہی تھی، اب پھر مقبول ہوئی۔ مگر کوئی مستقل رجحان ابھی صورت پذیر نہ ہو سکا۔ مجموعی اعتبار سے یہ دور غزل کے قبول عام کا دور ہے مگر یہ کہنا مشکل ہوگا کہ یہ غزل کی عظمت کا دور بھی ہے!

اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو غزل اس زمانے میں معنوی زوال سے دوچار ہوئی ہے اور نظم ترقی کرتی رہی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ادب میں جدید رجحانات کے حامیوں نے غزل کو رجعت و قدامت کا حلیف مان کر رد کر دیا تھا۔ ترقی پسندوں اور حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعروں نے نظم پر زیادہ توجہ صرف کی۔ اس وقت جب کہ غزل نے بلاشبہ اپنے تن ضعیف میں جان ڈالی تھی اور اس کی توانائی کے آثار روشن ہونے لگے تھے، یہ اس کے لیے ایک سخت آزمائش کا دور تھا۔ پھر بھی اسے بعض ایسے شاعر میسر آگئے جنھوں نے تخلیق کے سرچشموں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور غزل کو تاثیر، وسعت اور گہرائی دی۔ ان میں ناصر کاظمی، باقی صدیقی اور ابن انشا کے علاوہ احمد فراز، شکیب جلالی، ظفر اقبال، منیر نیازی، سلیم احمد، شہزاد احمد اور احمد مشتاق وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان شاعروں نے غزل کو قدیم موضوعات، لفاظی اور تکرار سے نجات دلا کر ایک نئی تخلیقی قوت بخشی۔ اس عمل کے پس پشت شاعروں کی شخصیت کا مکمل ادراک اور ان کی شخصیت کے انتشار کی ایک نئی شیرازہ بندی تھی۔ اس آزمائشی دور میں نظم کے دوش

بدوش غزل بھی اپنے تخلیقی امکانات کو بروے کار لاکر ایک تازہ اور دل فریب صورت میں سامنے آئی ۔ ان سے قبل کے شعرا بالعموم نظریاتی وابستگیوں کے اسیر رہے اور زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کے بجائے نظریات اور نعروں کے خول میں رہ کر تحفظ ذات کا سامان کرتے رہے ۔ نئے شعرا زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہوئے ۔ انھوں نے بعض خارجی حقائق مثلاً معاشرت، زندگی، فطرت اور کائنات کے ادراک سے اپنے رویہ کو تبدیل کر لیا تھا ۔ اس رویے نے غزل کو روایت سے قدرے انحراف کر کے اپنے خلقی اوصاف کو دریافت کرنے پر مجبور کیا ۔

یہ تو وہ صورتِ حال تھی جس میں تقسیم ہند کے بعد بالعموم دونوں ملکوں ۔۔۔ بھارت اور پاکستان میں غزل کو نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ۔ پھر بھی بھارت میں غزل کو تخلیقی سطح پر ان تجربوں سے اس طرح نہیں گزرنا پڑا جو پاکستان میں پیش آئے ۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کو بڑی حد تک پاکستان میں زیادہ فروغ اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔ قیام پاکستان کے بعد ایک عرصے تک یہاں اضطراب و انتشار کی صورتِ حال رہی ۔ بڑے پیمانے پر فسادات اور ہجرت نے نئے احساسات کو جنم دیا اور شعرا اپنے تخلیقی طرزِ فکر میں تبدیلی پیدا کر کے داخلیت کی طرف رجوع ہوئے ۔ یہ میلان خودکوشی و خودآگہی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ۔ تقسیم کے تجربات و احساسات کو پرانی نسل کے وہ شعرا جن کی دنیا میں کوئی ہلچل اور اضطراب پیدا نہیں ہوا، کماحقہ ادا نہیں کر سکتے تھے ۔ لیکن جو اس صورتِ حال سے کسی بھی طرح متاثر ہوئے، وہ نئی نسل کے خود

آگہی و خودکوشی کے تجربے میں نفسیاتی اور تخلیقی طور پر شریک ہو گئے۔

پرانے اور بزرگ شاعروں کی نسل میں، جو یا تو ہجرت کر کے بھارت سے پاکستان آگئے یا یہیں مقیم تھے، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی، ظفر علی خاں، بہزاد لکھنوی، آل رضا، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر، صوفی تبسم، عابد علی عابد، احسان دانش، شورعلیگ، عبدالحمید عدم، ماہر القادری کے نام اہمیت کے حامل تھے ۔ ان شاعروں میں ظفر علی خاں، بہزاد لکھنوی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی کو بہت عرصے پہلے شہرت حاصل ہو چکی تھی، جب کہ ظفر علی خاں کی غزل گوئی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ سیماب اکبرآبادی اور بہزاد لکھنوی نے پاکستان کے دور میں کسی خصوصیت یا تبدیلی کا اظہار نہ کیا، حفیظ اور جوش کو اگرچہ اہمیت اور مقبولیت نظم نگاری کی وجہ سے حاصل ہوئی، بلکہ یہ دونوں بنیادی طور پر نظم کے ہی شاعر ہیں ۔ پھر ان میں سے جوش نے تو غزل کی مخالفت بھی کی، اس کے باوجود ان دونوں نے کافی تعداد میں غزلیں کہیں ۔ جوش نے غزل کو اپنا مخصوص رنگ دینے کی کوشش کی ہے، چناں چہ ان کی غزلوں کا انداز عام طور پر وہی ہے جو ان کی نظموں میں پایا جاتا ہے ۔ اس اعتبار سے ان کا مزاج غزل سے مناسبت نہیں رکھتا۔ مثلاً ان کے یہ شعر:

اے کلی ناز سے کھل بادۂ سر جوش ابل

کہ نگار چمن و شاہد مستاں آیا

خاطر جمع سے ہشیار کہ برہم ہوئی زلف
کشش دل سے خبردار کہ طوفاں آیا
جا کے نسیم جاں ستاں کہنا یہ بزم حسن میں
بھیجا ہے تحفہ و سلام جوش سحر پرست نے

یہ اشعار نظم کے مزاج سے قریب تر ہیں۔ لیکن ان کی بعض غزلوں میں تغزل بھی موجود ہے۔ مثلاً:

شب وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے ؟ وقت کیا ہو گا
تمناؤں کے غنچے ہم نفس کھلائے جاتے ہیں
حد ہے اپنی طرف ہنیں میں بھی
اور ان کی طرف خدائی ہے

جوش اگرچہ "شاعر انقلاب" رہے ہیں، لیکن "شبابیات" ان کا دل پسند موضوع ہے اور وہ اس رنگ میں پوری طرح نمایاں ہوئے ہیں۔ انھوں نے غزل میں خیال آرائی کا عنصر شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والے ان کے شعری مجموعوں (۱) میں "نجوم و جواہر" اور "الہام و افکار" اہمیت رکھتے ہیں۔ اب اس دور میں ان کے کلام میں ایک انتہا درجے کی مایوسی اور محرومی کا احساس موجزن ہے:

چپ رہوں تو ہر نفس ڈستا ہے ناگن کی طرح
آہ بھرنے میں ہے رسوائی کسے آواز دوں

اف خموشی کی یہ آہیں دل کو برماتی ہوئی

اف یہ سناٹے کی شہنائی کسے آواز دوں

حفیظ نے نظم نگاری میں شہرت حاصل کی اور دراصل گیت نگاری نے انھیں ممتاز کیا، لیکن غزلیں بھی انھوں نے بڑی تعداد میں لکھیں۔ ان کے تازہ شعری مجموعے "چراغ سحر" میں کئی غزلیں شامل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں وہ کسی انفرادیت اور خصوصیت کا اظہار نہ کر سکے۔ عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت نے بھی قیام پاکستان سے قبل ادب و شعر کے تمام مراحل طے کر لیے تھے، بعد میں انھوں نے خصوصاً غزل گوئی میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ سالک کا رجحان نظم نگاری کی طرف زیادہ تھا، غزلیں انھوں نے ویسے بہت کم لکھیں (شعری مجموعہ : رہ و رسم منزلہا)۔

حسرت کا میلان غزل کی طرف زیادہ تھا اور اس میں کلاسیکی طرز کا پورا رچاؤ بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ دونوں بزرگ قیام پاکستان کے بعد غزل گوئی کے جائزے میں خاص مقام نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر تاثیر بھی انہی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں غزل گوئی سے خاص مناسبت تھی اور اس میں شگفتگی اور تازگی پائی جاتی ہے۔ متعدد اشعار پر کیف اور اثر انگیز لکھے۔ "آتشکدہ" جو ان کا واحد شعری مجموعہ ہے، ایسے اشعار سے مزین ہے :

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہہ دی

بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

زلفِ آوارہ گریباں چاک اے مست شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں
لبالب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے
نہ جانے کیا کہا میں نے نہ جانے کیا ہوا مجھ سے

عابد علی عابد (شعری مجموعے: شب نگار بنداں، بریشم عود) نے متعدد اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن تغزل ان کی شاعری میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔ خصوصاً غزلوں میں، جو انھوں نے بڑی تعداد میں لکھیں، جاذبیت اور لطیف توازن کے ساتھ ملتا ہے۔ انھوں نے عربی و فارسی کے ادب شناس اور ایک بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے شعر کے جمالیاتی پہلوؤں پر خاصہ زور دیا اور فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ چناں چہ میر، غالب، آتش وغیرہ کے رنگ کی جھلکیاں ان کے کلام میں عام ہیں۔ زبان کی دل کشی اور صوتی خوش آہنگی کے سبب ان کے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ تغزل کی یہ ایسی خصوصیات ہیں جو انھیں کئی دوسرے معاصرین کے مقابلے میں ممتاز کرتی ہے۔ مثلاً ان کے یہ چند شعر:

گھر کے گوشے میں تھے کہیں پنہاں
جتنے سیلاب گھر سے گزرے ہیں
دم رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل
یہی خطا ہے کہ اس دار و گیر میں ہم لوگ
دل شگفتہ، جبین کشادہ رکھتے ہیں

اے التفاتِ یار مجھے سوچنے تو دے

مرنے کا ہے مقام یا جینے کا ہے محل

صوفی تبسم (شعری مجموعہ : انجمن) نے بھی استادانہ فکر و فن کے جوہر بڑی مہارت سے اپنی غزلوں میں سموئے ہیں۔ ان کی غزلیں حسن و عشق کی رنگین داستانوں کے ساتھ ساتھ حساس اور درد مند دل کی وارداتیں بھی ہیں۔ انھوں نے حسن و عشق اور غم روزگار کے جذبات و احساسات کو نہایت درجہ سادگی اور نغمگی و ترنم کے ساتھ شعر کا قالب دیا ہے:

ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقش پا کا گماں

قدم قدم پہ تری رہ گزر سے گزرے ہیں

اس موسم گل ہی سے بہکے نہیں دیوانے

ساتھ ابر بہاراں کے وہ زلف بھی لہرائی

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں

بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

عبدالحمید عدم نے ویسے تو نظم، گیت اور قطعات بھی بہ کثرت لکھے، لیکن ان کا مخصوص سرمایہ کمال ان کی غزلیں ہیں۔ رندی و سرمستی کی باتیں انھوں نے غزلوں میں اس کثرت سے کہیں کہ ریاض خیرآبادی کی روایت کو نہ صرف جلا دی بلکہ اس میں سوز و گداز، شعریت، شوخی، بذلہ سنجی، طنز اور کیف و سرور کو مزید نکھار بھی دیا ہے۔ رومانیت بھی ان کے کلام کا خاصہ ہے، یہاں تک کہ اختر شیرانی کے بعد شاید کسی اور شاعر نے رومانیت کو اس حد تک اختیار نہیں کیا۔ عدم نے بکثرت غزلیں اور نظمیں لکھیں کہ ان کا کلام تیس سے زائد شعری

مجموعوں پر میحط ہے (مثلاً : گردش جام، رم آہو، پیچ و خم، نقش دوام، درد و درماں، رنگ و آہنگ وغیرہ) لیکن اس کے باوجود بشاشت اور شگفتگی کا عنصر ان کے اشعار میں کم نہیں ہوا۔ ان کی ساری شاعری خیالات اور جذبات کی شاعری ہے۔ اس میں حکیمانہ اور مفکرانہ گہرائی مشکل ہی سے تلاش کی جا سکتی ہے۔ ان کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جس میں گداختگی اور بے ساختگی دونوں بہت نمایاں ہیں اور انھیں سلیس، رواں اور بے تکلف اندازِ بیان پر قدرت حاصل ہے:

صرف اک قدم اٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر ہمیں ڈھونڈھتی رہی

ساقی کے التفات سے کچھ بات بن گئی
ورنہ حیات و موت میں کس کو تمیز تھی

پریشاں رنگ، ویراں نکہتیں، ڈوبے ہوئے نغمے
گلستاں سے ہجوم بے خودی کیا کیا اٹھا لایا

مرا جنوں تیری آنکھوں سے کچھ ہوا رسوا
تری خبر مری ہستی سے گاہ گاہ ملی

احسان دانش اور ماہر القادری کو اصل شہرت ان کی نظموں کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ لیکن ان دونوں شاعروں نے دل کش غزلیں بھی کہی ہیں۔ احسان دانش (شعری مجموعے : آتش خاموش، شیرازہ، زخم و مرہم وغیرہ) کے بارے میں ایک عام رائے یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فی الاصل نظم کے شاعر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل ان کی نظم کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ان کی غزلوں کا حاوی رجحان جذبات نگاری کی طرف ہے اور وہ معرفت اور آگاہی کے موضوعات کو زیادہ منتخب کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی غزل گوئی نے ایک مخصوص انداز اختیار کیا ہے:

اب تو ہر دھڑکن کسی کے پاؤں کی آواز ہے
دل میں یارب کون مصروفِ خرام ناز ہے

وصل کا خواب کجا لذتِ دیدار کجا
ہے غنیمت جو ترا درد بھی حاصل ہو جائے

یہ پچھلی رات یہ خاموشیاں یہ ڈوبتے تارے
نگاہِ شوق بہکی پھر رہی ہے التجا ہو کر

ان کے مقابلے میں ماہر القادری (شعری مجموعہ: فردوس) نے ایک زمانے میں نظمیں بھی بہت پرکیف اور دلکش لکھیں، لیکن غزل گوئی میں بھی وہ اس معیار پر بلکہ بعض مقامات پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بلندی پر ہیں جو انھوں نے نظم میں قائم کیا تھا۔ ان کی غزلوں میں مضامین نو اور تنوع کی بہتات ہے اور ان میں جذبات، خیالات، فکر و نظر اور علم و حکمت کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ چند مثالیں یہ ہیں:

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

پھر تصور نے دے دیا دھوکا
پھر کوئی سامنے سے آتا ہے

شب وعدہ وہ اب تک آرہے ہیں
ستارے ہیں کہ ڈوبے جارہے ہیں

نبضِ امید چھٹ گئی شاید | آج دل کیوں سکوں پہ مائل ہے
آرزو کو سمجھ رہا ہے رقیب | تنگ ہوں دل کی بدگمانی سے
کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے | دل کی ہر چوٹ ابھر آئی ہے
آرزو اک فریب باطل ہے | عشق خود عشق ہی کا حاصل ہے

شور علیگ (شعری مجموعے : نبضِ دوراں، دیوار ابد) کا شمار بھی ان شاعروں میں ہوتا ہے جن کو شہرت نظم نگاری کی وجہ سے حاصل ہوئی اور وہ ایک خوش فکر شاعر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ غزلیں ابتدأ کم لکھیں لیکن پھر اس کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ان کے کلام میں زندگی کی کیفیات، مشاہدہ، فکر واحساس اور دردو الم کی خصوصیات عام ہیں۔

عندلیب شادانی نے اپنے مخصوص انداز میں بعض نہایت دلکش غزلیں اور کئی بہت خوبصورت اور دلآویز اشعار تخلیق کیے جن میں بعض زبان زدعام وخاص ہوئے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد (۱۹۵۱ء میں) ان کا شعری مجموعہ "نشاط رفتہ" شائع ہوا، لیکن اس کے بعد کوئی قابل ذکر چیز سامنے نہیں آئی۔ ان کے سارے کلام میں جذبے کی شدت اور تخیل کی ندرت بہت نمایاں ہے۔ زبان و بیان کی سلاست اور دلکشی ان کی ایک مزید خصوصیت ہے۔ آل رضا (شعری مجموعہ : غزل معلیٰ) ان اساتذہ فن میں تھے، جو پختگی عمر میں لکھنو کی بساط شاعری کو رونق دے کر پاکستان آئے تھے۔ اپنے کلام کی پختگی اور استادانہ شان کی بدولت غزل کو کلاسیکی روایات سے منزہ کرتے رہے ہیں۔

عاشقانہ جذبات کو سلاست اور سادگی کے ساتھ ادا کرنے میں انھیں خاصی مہارت حاصل تھی:

یادش بخیر دل کا خیال آکے رہ گیا

اس بے دلی میں جیتے ہیں کس بے دلی سے ہم

انتظار آپ کا پتھرائی ہوئی آنکھوں میں

مہرباں یاد یہ مٹتی ہوئی تصویر رہے

یہ تو وہ شعرا تھے جو قیام پاکستان سے قبل ہی شہرت اور قبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان میں زیادہ تر شاعروں نے غزل میں قدیم روایات و محاسن اور اسلوب و ادائیگی میں حسن و دلکشی پیدا کی تھی۔ ان میں سے بعض شاعروں کی غزلوں میں اردو غزل کے رسمی عناصر سے گریز کا انداز نظر آتا ہے اور نئے رنگ و آہنگ کو غزلوں میں سمونے کی کوششیں بھی ملتی ہیں۔ گو ان میں سے تقریباً سب ہی شاعروں کے کلام میں رسمی عناصر موجود ہیں اور بعض کا اندازِ بیان کہیں کہیں بے اثر ہو کر رہ گیا ہے، لیکن پھر بھی اپنی خصوصیات کے سبب ان کی غزلیں پاکستانی غزل کے سرمایہ میں وقیع اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

**حاشیہ:**

(۱) یہاں محض ان شعری مجموعوں کا حوالہ دیا جارہا ہے جو صرف غزلوں پر مشتمل ہیں یا دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ ان میں غزلیں بھی شامل ہیں اور یہ مجموعے قیام پاکستان کے بعد اور زیر جائزہ دور میں شائع ہوئے۔

باب دوم

# پاکستانی غزل کے ابتدائی رجحانات

# پاکستانی غزل کے ابتدائی رجحانات

## غزل میں "ترقی پسندی" کا رویہ

قیام پاکستان کے بعد شاعروں کی جو نسل نمایاں ہوئی وہ بالعموم یا تو ترقی پسند ادب کی تحریک سے متاثر تھی یا حلقہ ارباب ذوق کی تحریک سے۔ غزل میں ترقی پسند ادب کے وسیلے سے سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی اور تنقید کا عنصر ابھر کر سامنے آیا۔ یہ رجحان ویسے تو اردو شاعری کے ہر دور میں نمایاں رہا ہے، لیکن ترقی پسند تحریک سے وابستہ یا متاثر شاعروں نے اسے اس حد تک اہمیت دی کہ یہ صحافت اور نعرے بازی کے قریب پہنچ گیا۔ اس رجحان سے اردو غزل کے بعض مسلمہ تصورات، جیسے 'غم جاناں اور عشق' ترقی پسند شاعروں کے کلام میں اپنے روایتی مفہوم کے لحاظ سے مفقود ہو گئے اور انھوں نے غم دوراں میں اپنے آپ کو ضم کر لیا۔ فیض، ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، حبیب جالب، فارغ بخاری، حمایت علی شاعر، احمد راہی، ظہور نظر وغیرہ ترقی پسند شاعروں میں غزل گوئی کے اعتبار سے ممتاز ہیں، لیکن ان میں سے کئی شاعروں نے شاعری کو زندگی کی تنقید اور ترجمانی قرار دینے کے باوجود اسے محض سیاسی اور سماجی حالات کی ترجمانی تک محدود رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے قریبی عہد کے شاعروں اقبال، یگانہ اور فراق

کے مقابلے میں بھی زندگی کو اس کے وسیع و عریض تناظر میں نہ دیکھ سکے اور غزل گوئی میں تو کوئی شاعر ترقی پسندوں میں اس سطح کا پیدا نہ ہو سکا۔ فیض یقیناً ترقی پسند شاعروں میں بہت ممتاز ہیں۔ نظم اور غزل دونوں اصناف میں ان کی تخلیقات دوسرے ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں امتیاز رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی غزل میں انہیں اقبال کا ہمسر یا اقبال کے بعد بہترین غزل گو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے باوجود فیض قیام پاکستان کی پہلی دہائی کے ممتاز غزل گو ہیں۔ وہ پہلے سے غزل کے مزاج سے آشنا تھے۔ ان کے اولین شعری مجموعے "نقش فریادی" (۱۹۴۰ء) نے تقسیم ہند سے قبل نظم کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی ان کی حیثیت کو متعین کر دیا تھا۔ اس عہد میں فیض نے اپنے لیے ایک تخلیقی دنیا بسائی تھی، جس میں وہ غم دوراں کی تلخیوں سے فرار حاصل کر کے پناہ لے لیتے تھے۔ اس میں ایک مخصوص تازگی و شگفتگی اور حسن کا صحیح اور واضح احساس موجود تھا۔ اس دور میں ان کے کلام میں فکر کی گہرائی یا احساس کی بیداری تو زیادہ نہیں لیکن حسن کے لطیف و نازک احساسات تک ان کی رسائی ضرور رہی۔ مگر "نقش فریادی" کے آخری دور کی تخلیقات سے لے کر "دستِ صبا" (۱۹۵۲ء) تک پہنچتے پہنچتے ان کے کلام میں وہ پچھلی فراریت ختم ہو گئی اور احساس کی شدت، جذبات کا خلوص اور ان سے زیادہ عمل کی خواہش نے ان کے موضوعات میں اضافہ اور زندگی پیدا کر دی ہے۔ اس عہد میں "دستِ صبا" غزل کے سرمایے میں ان علامتوں اور استعاروں کی تلاش ہے جو غزل کو نئی معنویت دے سکتے تھے۔ اس تلاش نے کلاسیکی لہجے کی بازیافت کا راستہ بھی

دکھایا ہے ۔ انتخابِ الفاظ میں انھوں نے مروجہ الفاظ و تراکیب کو نئی معنویت عطا کی ۔ چناں چہ قفس، صیاد، ساقی، گلشن، محتسب وغیرہ جیسے الفاظ میں ہی انھوں نے سیاست و رومانیت اور عشق و انقلاب کا امتزاج پیش کیا ۔ " زنداں نامہ " (۱۹۵٦ء) فیض کے ان تجربات کا ایک اگلا قدم ہے ۔ نئے تجربات نے فیض کے اسلوب میں کلاسیکیت کو جدید طرزِ احساس و اظہار سے آمیز کر کے انھیں غزل کے احیا کا پیشرو بنا دیا ۔ یہاں فیض کی فکری پختگی میں جو بدلتے ہوئے ماحول کی بنا پر ان کے اندر پیدا ہوتی رہی ہے، گہرائی اور استقامت نے ان کے اظہار کو زیادہ واضح اور بامعنی بنا دیا ہے :

ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

" دستِ تہ سنگ " (۱۹٦۵ء)، " سروادیِ سینا " (۱۹۷۱ء)، " شام شہر یاراں " (۱۹۷۸ء) اور " مرے دل مرے مسافر " (۱۹۸۱ء) تک میں موجود فیض کی غزلیں اپنی شعری خصوصیات اور مزاج کے تعلق سے عموماً انہی ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ " نقش فریادی " یا بلکہ " دستِ صبا " سے شروع ہوا تھا ۔ کہیں کہیں فیض نے ایک تو وقت کے ان مسائل کی ترجمانی کی ہے، جن سے اجتماعی جذبات وابستہ ہوتے ہیں، دوسرے زبان و بیان کے ایسے پیرائے استعمال کیے جو عموماً مانوس اور پر اثر تھے ۔ فیض نے شاعری کی مثبت روایات سے اپنی شاعری کو علاحدہ نہیں رکھا ۔ پرانے استعارے استعمال کیے لیکن اس سے بڑھ کر نئے اور مخصوص معاشرتی

و سیاسی پس منظر کے حامل استعارے بھی تخلیق کیے، منفرد علامتیں بھی استعمال کیں، روایتوں سے کام لیا اور نئے تجربوں سے استفادہ بھی کیا۔ زبان کے مانوس اسالیب بھی اختیار کیے اور اپنی ترکیبیں بھی وضع کیں جو خاصی معنیٰ خیز اور انفرادی شان رکھتی ہیں۔ اپنے مخصوص نظریات کو جذبات کے طور پر محسوس کیا، لیکن بغاوت اور نعرہ زنی سے دور رہے۔ ان کی نظر بالخصوص اظہار پر رہی۔ رومان سے حقیقت تک اور حقیقت سے رومان کی طرف ان کی آمدورفت ابتدا سے اب تک جاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ فیض آج بھی پاکستان کے ممتاز شاعروں میں سرفہرست ہیں اور ہر آٹھ دس سال کے بعد ان کا ایک نیا شعری مجموعہ مرتب ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اب ان کی تازہ غزلوں کو ان کی بہتریں غزلوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی تازہ غزلوں میں سے چند اچھے شعر منتخب ہو جائیں۔ جیسے:

کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب
درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

یہ موسم گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوال گل و لالہ غم انگیز بہت ہے

خوشا کہ آج ہر اک مدعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندہء زمانہ کیا

پاکستان و بھارت میں مقبولیت کے باوجود فیض کی غزل نئے تجربات اور نئی نسل کے حساس و منفرد شعرا کے لیے وسیلہء اظہار نہیں بن سکی ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی شاعری کی بنیادیں سماجی زندگی میں گہری نہیں ہیں ۔ ان کا فن جذباتی کیفیت اور اجتماعی شعور رکھتے ہوئے بھی اجتماعی زندگی کی بھرپور نمائندگی سے قاصر رہا ہے ۔ چوں کہ ان کی نظر تجزیاتی نہیں ہے، اس لیے وہ زندگی کی تہوں میں اتر کر حقیقتوں کی دریافت میں ناکام رہے ہیں ۔ ان کی شاعری میں ذوق جمال اور جمالیاتی اظہار اتنا زیادہ ہے کہ فکر کے عنصر میں کمی محسوس ہوتی ہے ۔ انھوں نے بیان کی طرف تو خاطر خواہ توجہ دی ہے لیکن غزل کے اسلوب کے نئے امکانات سے کم کام لیا ہے ۔ پھر انھوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کے رجحان کے تحت بعض علامتوں کو، جو روایت بنتی جارہی تھیں، از سرِ نو زندگی دی اور جدید شاعری کے سرمایے میں کلاسیکی علامتوں کو نئی معنویت بھی عطا کی ۔ لیکن دراصل یہ ان کی خوبی بھی ہے اور ساتھ ہی ان کے اسلوب کی تنگ دامانی بھی ۔

فیض کے ساتھ ساتھ پاکستان میں ان کی نسل کے غزل گو شعرا میں احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور قتیل شفائی کے نام نمایاں ہیں ۔ ان میں ندیم قاسمی کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہے کہ ان کے کلام میں فکر کا عنصر جدید طرز احساس کے ساتھ بہت زیادہ کامیابی سے شامل ہوا ہے ۔ لیکن جذبہ بھی ان کی شاعری کا ایک امتیازی وصف رہا ہے اور یہ وصف ان کی اولین شعری کاوشوں میں بہت نمایاں تھا ۔ تقسیم ہند کے وقت تک ان کے دو شعری مجموعے

"جلال و جمال" اور "دھڑکنیں" (بعد میں "رم جھم" کے نام سے) شائع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک "شعلۂ گل" (۱۹۵۳ء)، "دشتِ وفا" (۱۹۶۴ء)، "محیط" (۱۹۷۷ء) اور "دوام" (۱۹۷۹ء) شائع ہوئے ہیں۔ ذاتی کرب و احساس اور فکری بالیدگی ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ ان کے موضوعات اور مشاہدات و احساسات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور حیات و کائنات کے مسائل، حسن اور انسانی عظمت کا احساس ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ جدتِ فکر اور ندرتِ اظہار کے لحاظ سے ان کا سرمایۂ شاعری بیشتر ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

انداز ہوبہو تری آواز پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

تو نیند میں بھی میری طرف دیکھ رہا تھا
سونے نہ دیا مجھ کو سیہ چشمیٔ شب نے

اسے چھونا بھی ممکن سوچنا بھی تجھ کو ناممکن
تری دنیا میں یارب تجھ کو پوجیں یا اسے چاہیں

آنکھ کھولی تو جہاں کانِ جواہر تھا ندیم
ہاتھ پھیلائے تو ہر چیز کو عنقا دیکھا
تم کو خوش آئی نہ شاید مرے پلکوں کی نمی
دل میں اترے ہو تو آؤ مرا صحرا دیکھو

ظہیر کاشمیری (شعری مجموعہ : عظمتِ آدم، تغزل، چراغ آخر شب) نے غزل کو "انسانی دماغ کے طبعی عمل سے بہت قریب" محسوس کیا ہے اور بطورِ خاص اس پر توجہ دی ہے ۔ ان کی غزل بنیادی طور پر بیانیہ اوصاف کی حامل ہوتی ہے اور فکر اور اظہار کی جدت و ندرت سے یکسر خالی نہ ہونے کے باوجود تاثیر میں پیچھے ہے ۔ لیکن وہ غزل کے مزاج سے واقف ہیں اور ان کی بعض غزلیں روایتی حسن بھی رکھتی ہیں :

یہ رات یہ بیکراں اندھیرے
اک دل کا چراغ جل رہا ہے
اٹھی چلمن تو تھا غرفے میں مہتاب
بڑے کام آگئی شوخی صبا کی

قتیل شفائی اور سیف الدین سیف اس اعتبار سے اچھی غزلوں کے خالق ہیں کہ دونوں نے کلاسیکی اور روایتی اسلوب کو ندرتِ اظہار کے ساتھ اختیار کیا ہے ۔ یہ دونوں بنیادی طور پر غنائی شاعر ہیں ۔ چناں چہ خصوصاً قتیل کی منظومات میں بھی تغزل کی صفات بڑی نمایاں ہیں ۔ قتیل نے زندگی کے حقائق کو بڑے لطیف اور مترنم لہجے اور سلیس زبان میں ادا کیا ہے ۔ ان کے

شعری مجموعوں (گجر، جلترنگ، روزن، چھتنار، گفتگو) میں ان کی نمائندہ غزلیں ملتی ہیں۔ سیف الدین سیف، جن کا صرف ایک شعری مجموعہ (خم کاکل) منظر عام پر آیا ہے، مزاج کے لحاظ سے تغزل سے بڑی مناسبت رکھتے ہیں۔ روایت کا ان پر اس حد تک اثر ہے کہ وہ ہر بات ایجاز و کنایے میں کہنے کے عادی نظر آتے ہیں۔ گو ان کے کلام میں "خم کاکل" سے مناسبت رکھنے والے موضوعات کافی نمایاں ہیں، لیکن اس میں زندگی کی ناہمواریاں اور عصری مسائل و مصائب کا احساس بھی شدومد کے ساتھ موجود ہے۔ جہاں تک حسن ادا کا تعلق ہے ان کا طریق اظہار نہایت شفاف اور دلکش ہے۔ یہ اور قتیل آپس میں اس مسئلے میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں:

دل کی تنہائی کا مجھ کو خود بھی اندازہ نہیں
یہ اک ایسا گھر ہے جس کا کوئی دروازہ نہیں

گرمیِ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

دادِ سفر ملی ہے کسے راہِ شوق میں
ہم نے مٹا دیے ہیں نشاں اپنے پاؤں کے

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

---قتیل شفائی

اللہ اللہ وہ ستم گر بھی یہی کہتا ہے

مجھ سے یہ درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے

ہر اک چلن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے

زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

چلے ہیں سیف وہاں ہم علاج غم کے لیے

دلوں کو درد کی دولت جہاں سے ملتی ہے

سیف کچھ چاہیے تھا مٹنے کو

بن گئے نقش زندگی ہم بھی

---سیف الدین سیف

عارف عبدالمتین، فارغ بخاری، حمایت علی شاعر، احمد راہی اور ظہور نظر بھی اسی صنف کے شاعر ہیں - ان میں سے حمایت علی شاعر اور فارغ بخاری نے تغزل کی اچھی خصوصیات کا اظہار کیا ہے - فارغ بخاری (شعری مجموعے : زیر و بم، شیشے کے پیرہن) کے یہ شعر تو زندہ رہنے کی بڑی صلاحیتیں رکھتے ہیں :

یاد آئیں گے زمانے کو مثالوں کے لیے

جیسے بوسیدہ کتابیں ہوں حوالوں کے لیے

(گو اس موقع پر احمد فراز کا ایک شعر بھی یاد آجاتا ہے :

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں)

یا:

یوں کھڑا ہوں اس نشیلی دھند میں کھویا ہوا

جیسے مدت سے اسی جنگل میں ہوں بویا ہوا

فارغ بخاری اور ظہور نظر نے زندگی کی تلخیوں اور حالات کو گہری نظروں سے دیکھا ہے۔ چناں چہ ان کی غزلوں میں یہ تلخیاں اور حقائق ایک خاص موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً:

کچی کلیاں پکی فصلیں سر چھپائیں گی کہاں

آگ شہروں کی لپک کر آرہی ہے گاؤں میں

کرے گا کوئی بغاوت حیات سے کیسے؟

نکل کے جائے، کوئی کائنات سے کیسے؟

---فارغ بخاری

واسطے جتنے تھے سب وہم و یقیں نے چھوڑے

آسماں سر سے ہٹا پاؤں زمیں نے چھوڑے

"انقلاب آنے کو ہے سنبھلو" لکھا تھا جن پر

ہاں فضاؤں میں غبارے وہ ہمیں نے چھوڑے

---ظہور نظر

عارف عبدالمتین (شعری مجموعے دیدہ و دل، صلیبِ غم، چراغ کا گھاؤ وغیرہ) ایک زمانے سے غزل کہہ رہے ہیں، لیکن ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو شعر کہتے کہتے تھک جاتے ہیں۔ ان کی شاعری ہنوز ارتقائی مراحل طے کر

رہی ہے اوران کے کلام میں اچھے شعر مل جاتے ہیں ۔ خودآگاہی اور خودکوشی ان کے کلام کی ایک دلکش صفت ہے :

میں سمندر تھا مگر جب تک رہا تجھ سے جدا

اپنی گہرائی کا خود مجھ کو بھی اندازہ نہ تھا

سحاب صبحیں گلاب شامیں کبھی مری تھیں مگر میں اب خود

سحاب بن کر برس رہا ہوں گلاب بن کر چٹک رہا ہوں

حمایت علی شاعر (شعری مجموعے : آگ میں پھول، مٹی کا قرض) بھی اسی قبیل کے شاعر ہیں ۔ لیکن ان کے اور عارف کے بارے میں اب بھی یہ کہنا کہ ترقی پسند شاعروں کے زمرے میں شامل ہیں، شاید صداقت پر مبنی نہ ہو گا ۔ ابتداًء ان دونوں شاعروں نے بالخصوص اپنی نظموں سے یہ تاثر قائم کیا تھا، لیکن اب ان کی غزل گوئی میں کسی مخصوص فکر اور رجحان کو شاید تلاش نہ کیا جاسکے ۔ حمایت علی شاعر کی غزلیں خیال اور بیان کی تازگی کی اچھی مثالیں ہیں ۔ ان کی متعدد غزلوں میں جذبہ و احساس کی شدت بھی بہت موثر طور پر جھلکتی ہے، لیکن فکر کا عنصر زیادہ حاوی رہتا ہے ۔ اپنی غزلوں کو وہ عصری تقاضوں اور اجتماعی احساس سے بھی ہم آہنگ رکھتے ہیں اوراس میں کامیاب بھی ہیں :

اک دوسرے کی زد میں ہیں مہرے کچھ اس طرح

ڈر ہے الٹ نہ جائے کہیں یہ بساط بھی

الزام اپنی موت کا موسم پہ کیوں دھروں

میرے بدن میں میرے لہو کا فساد تھا

تمھارے غم میں بھی رکھتے ہیں ہم قرینۂ زیست
تمھارے غم سے شعور غم زمانہ ملا
نہ جانے یہ شب غم صبح تک کیا رنگ لائے گی
نفس کے ساتھ اک تلوار سی چلتی ہے سینے میں

احمد راہی (شعری مجموعہ : نرنجن) کی غزلیں تغزل اور غزل کی حسین روایتوں اور تاثیر سے عاری نہیں ۔ انھوں نے علامتوں اور دلکش استعاروں سے بھی غزل کے حسن میں اضافہ کیا ہے ۔ لیکن انھوں نے غزلیں کم کہی ہیں ۔ حبیب جالب (شعری مجموعے : برگِ آوارہ، سر مقتل، عہدِ ستم، گوشے میں قفس کے، ذکر بہتے خون کا) کی شاعری کا آغاز ایک اچھے غزل گو کی طرح ہوا ۔ بعض موضوعات بالخصوص یاد ماضی کے لحاظ سے ان میں اور دیگر اہم شاعروں جیسے ناصر کاظمی اور حفیظ ہوشیارپوری میں مماثلت بڑی آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہے، لیکن جالب کے کلام میں یہ موضوع ذاتی زندگی اور رومانی تجربات کے ساتھ مستقل وابستگی نہ رکھ سکا ۔ بہت جلد جالب نے اپنی نظموں کے ساتھ ساتھ غزل کو بھی سیاسی واقعات و حالات کے دھارے میں بہہ جانے دیا ۔ یہاں تک کہ یہ باتیں غزل کے حسن پر گراں محسوس ہونے لگتی ہیں ۔ ورنہ ان کی طبیعت کی روانی نے غزل کو بعض بہت دلکش پیرایے اور لہجے دیے تھے:

دنیا تو چاہتی ہے یوں ہی فاصلے رہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جا اس گلی میں چل

لیکن اب ان کی غزل گوئی کا یہ انداز ہے :

کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنھیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

کچھ بھی ہوتا پر نہ ہوتے پارہ پارہ جسم و جاں
راہزن ہوتے اگر ان رہنماؤں کی جگہ

روشنی کے دشمنوں نے روشنی ہونے نہ دی
ایک مدت تک خیال و فکر دھندلائے رہے

## "حلقہ ء ارباب ِذوق" کی غزل

قیام پاکستان کے وقت ترقی پسند ادب کی تحریک کے متوازی میراجی اور ان کے حلقہ ء اثر سے تعلق رکھنے والے شاعروں کے رجحانات بھی بڑے قوی تھے ۔ ان رجحانات نے "حلقہ ء ارباب ِذوق" کی تشکیل کی تھی ۔ اس وقت شاعروں کی اکثریت کو انہی دونوں مکاتب کے رجحانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایک وہ جو "انجمن ترقی پسند مصنفین" یا اس کے رجحانات سے وابستہ تھے اور دوسرے وہ جو میراجی کے رجحانات سے متاثر تھے ۔ میراجی کے رجحانات کو مختصر سے مختصر لفظوں میں اس طرح سمیٹا جاسکتا ہے کہ یہ داخلیت پر مبنی تھے ۔ اس کے تحت شاعروں نے نفسی کیفیات، جنسی جذبات، یاس، محرومی، خودکشی اور شکست خوردگی کے موضوعات کو زیادہ اہمیت دی ۔ لیکن یہ عجیب بات رہی کہ اس مکتب ِفکر کے شاعروں نے غزل کے مقابلے میں نظم اور اس کی مختلف صورتوں کی طرف زیادہ توجہ دی ۔ چناں چہ ان شاعروں

کے سرمایہ شعری میں نظموں کا حصہ زیادہ ہے اور غزلیں کم ہیں ۔ میراجی
(شعری مجموعے: تین رنگ، پابند نظمیں وغیرہ) بھی فی الاصل نظم کے شاعر تھے
اور یہ واقعہ ہے کہ ان کی نظمیں موضوع اور ہیئت ۔۔۔ ہر دو لحاظ سے بالکل
نئے رنگ میں لکھی گئی ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کی اکثر نظمیں بڑی پیچیدہ اور
مبہم ہیں ۔ لیکن ان کا یہ انداز صرف نظموں تک مخصوص رہا ۔ غزلیں، جو
انھوں نے کم لکھیں، اس طرز سے قطع نظر روایات کی پابندی کو ظاہر کرتی ہیں
یہ صاف ستھری ہیں اور ان میں دلکشی، روانی اور سوز و گداز ملتا ہے ۔ مثلاً:

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں
ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا بیٹھ اکیلے رونا ہو گا
چپکے چپکے بہا کر آنسو دل کے دکھ کو دھونا ہو گا

میراجی کے حلقہء اثر کے شاعروں میں مختار صدیقی، قیوم نظر، ضیا
جالندھری، یوسف ظفر کے نام اہمیت رکھتے ہیں، بلکہ اگر اس کا دائرہ وسیع کر
لیا جائے تو اس میں مجید امجد، وزیر آغا اور منیر نیازی کا نام بھی شامل کیا جاسکتا
ہے ۔ ان شاعروں نے علامتی اظہار کو خصوصیت سے اختیار کیا ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد
اردو ادب میں رجحانات کے لحاظ سے جو تحریکیں رونما ہوئیں، علامت نگاری کی
تحریک ان میں بہت نمایاں ہے ۔ اس تحریک کو میراجی اور ان کے حلقہء اثر
سے تعلق رکھنے والے شاعروں نے پروان چڑھایا ۔ ان شاعروں نے فرد کی
ذات کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور ذاتی علامتیں استعمال کیں ۔ یہ رجحان

اور یہ تحریک دراصل کئی اعتبار سے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے ردِ عمل میں تھی - ترقی پسند شاعر اجتماعی علامتوں کو اختیار کرتے تھے اور اجتماع کو اہمیت دیتے تھے - اس اعتبار سے دو رجحانات کا ایک متوازی ارتقا ہوتا رہا اور یہ صورتِ حال بالعموم ۱۹۶۵ء (پاک بھارت جنگ) تک نمایاں رہی - اس کے بعد ذات کی جگہ معاشرے کی اہمیت پھر واضح ہو گئی اور علامت نگاری اور ترقی پسندی کے رجحانات آپس میں خلط ملط ہو گئے -

مختار صدیقی (شعری مجموعہ: منزل شب) اس حلقے کے بہت ممتاز شاعر ہیں - ان کی سب سے نمایاں خصوصیت خیال و اسلوب کی جدت ہے - ان کی شاعری کا بڑا حصہ نرالی وضع اور انوکھے لہجے کے ساتھ ساتھ تغزل کا حامل ہے - ہندی کے رسیلے اور مترنم الفاظ سے انھوں نے اپنے کلام کو بڑی دل نشینی دی ہے - میر کا جو اثر اور رنگ ان کے کلام میں ملتا ہے وہ ایک مثال ہے - ویسے تو پاکستان میں ناصر کاظمی، ابن انشا اور شہرت بخاری وغیرہ نے بھی میر کے رنگ میں اچھی غزلیں لکھیں، لیکن مختار صدیقی سب سے زیادہ کامیاب رہے - انھوں نے غزلیں کم لکھیں مگر ان میں اچھے اشعار کی کمی نہیں:

جو جو صدمے ہم پہ گزرے کیسے ان کا بیان کریں
کون سا داغ نکال کے دل سے ثبت سرِ دیوان کریں

آج کی بات نہیں ان حالوں ہم کو برسوں گزرے ہیں
جوں توں رات گزاری لیکن دن کو سوا بے حال ہوئے

میل ملاپ کی باتوں میں اب سوچتے ہیں دلچسپی لیں
شاید یہ معلوم ہو کیوں کر ہم کو خوئے فراق ہوئی

قیوم نظر (شعری مجموعے : سویدا، قندیل) اور یوسف ظفر (شعری مجموعے : زہر خند، نوائے ساز، صدا الصحرا، عشق پیچاں) کی غزلیں ستھری، سادہ اور بالعموم روایتی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ موضوعات میں جذبات اور تخیل کو زیادہ دخل ہے۔ لیکن فکر کی رسائی بھی ملتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ضیاء جالندھری (شعری مجموعے : سرشام، نارسا) کی غزلوں میں جدید رجحانات کا اضافہ موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے دلکش اور پرکشش ہے۔ ان شاعروں نے غزلیں نسبتاً کم کہیں ہیں، لیکن جاندار اشعار جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔

لاکھ چاہوں مگر یہ امیدیں
بکھرے جاتے ہیں ریت کے دانے

برق ڈھکتی ہے اس تبسم میں
بجلیوں سے مجھے خطاب نہ کر

کیا موت نے بھی سیکھ لیے دلبری کے ڈھنگ
یہ طرز بے رخی تو اس آرام جاں کی ہے

درد و دیوار نقش پا کی صورت
کہاں جائے گی ویرانی یہاں سے

---قیوم نظر

گلشن کی شاخ شاخ کو ویراں کیا گیا
یوں بھی علاج تنگیء داماں کیا گیا
تیرا جلوہ بھی اگر صورتِ ہجراں ہوتا
تجھ سے کیا میں تیرے سائے سے گریزاں ہوتا
جاؤں کدھر کہ دشتِ تمنا میں ہر طرف
مجھ کو خود اپنے نقش قدم جا بجا ملے
---یوسف ظفر

ایسے رہا چمن میں کہ محسوس یہ ہوا
جو گل کھلا جو سبزہ اگا میرا جسم ہے
ہجر جاں کا زیاں وصل مرگ جنوں
جیتے رہنے کا امکان یوں ہے نہ یوں
لالہ گوں ہے ترا خیال مگر
اس میں کچھ حسرتوں کا خون بھی ہے
تمنا انتظار دوست کے بعد
کلی جیسے کوئی مرجھا گئی ہو
---ضیا جالندھری

وزیر آغا (شعری مجموعے :ون کا زرد پہاڑ، غزلیں، وغیرہ) نے اپنی نظموں میں خوبصورت علامات اور تخیل سے کام لیا ہے، لیکن انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی نظم کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے - یہ کوشش مناظر و کیفیات

کی مختلف صورتوں میں ملتی ہے۔ غزل میں ان کی علامتیں اور ان کا مخصوص انداز جو بہرحال ان پر ختم تو نہیں، منیر نیازی یا ایک دو اور نام اس سلسلے میں لیے جاسکتے ہیں، لیکن ان کا ایک انفرادی رنگ ضرور موجود ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ رنگ اور یہ انداز اپنے میں کوئی تاثیر نہیں رکھتا۔ ایک غزل کے یہ اشعار دیکھیے:

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

اترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمیں پر
پھر اک بھی سبز پات نہ سارے نگر میں تھا

پاگل سی اک صدا کسی اجڑے مکاں میں تھی
کھڑکی میں اک چراغ بھری دوپہر میں تھا

حالاں کہ انھوں نے یہ شعر بھی کہا ہے اور چاہتے تو اس طرح مزید شعر بھی کہہ سکتے تھے:

لوٹے اگر سفر سے کبھی ہم تو ڈر نہیں
صورت بدل کے آئیں گے بے نام آئیں گے

مجید امجد (شعری مجموعے: شب رفتہ، مرے خدا میرے دل، شب رفتہ کے بعد) بھی غزل میں اپنا انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ انہیں محض پیچیدہ تخلیقی شعور کا نتیجہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں روایت کا پاس بھی ملتا ہے لیکن تجربات اور جدتِ ادا کا رجحان بھی ان کا ایک بڑا محرک نظر آتا ہے۔

مخصوص زمین اور الفاظ انہیں اپنے دیگر معاصرین سے الگ رکھتے ہیں :

میں جو تری راگ سبھا میں راس رچانے آیا تھا
دل کی چھنکتی جھانجھن تیری پازیبوں میں ٹانک چکا
رت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں اف یاد کسی کی یاد
پھر سیل زماں میں تیر گیا اک نام کسی کا نام
اک لہرا ٹھی اور ڈوب گئے ہونٹوں کے کنول آنکھوں کے دیے
اک گونجتی آندھی وقت کی بازی جیت گئی رت بیت گئی
روش روش پہ ہیں نکہت نشاں گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول ارغواں گلاب کے پھول

منیر نیازی (شعری مجموعے :جنگل میں دھنک، تیز ہوا اور تنہا پھول، دشمنوں کے درمیان شام، اس بے وفا کا شہر، چھ رنگین دروازے، ماہ منیر وغیرہ) اپنی انفرادیت پسندی کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں - یہ انفرادیت پسندی ان کی غزلوں میں بھی اسی طرح ملتی ہے جو ان کی نظموں کا خاصہ ہے - ان کے اشعار میں رنگوں، موسموں، وقت، درخت، پھول اور پتے، جنگل، راستے، کھڑکیاں اور دروازے، گلیاں وغیرہ علامتوں اور استعاروں کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور یہ ان کی شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں - ان کے اشعار میں بالعموم ایک افسردہ رومانیت، اکتاہٹ اور بے کیفی چھائی رہتی ہے :

لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستوں

دل کو ہجوم نکہت مہ سے لہو کیے
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

عادت سی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

منیر کی غزلوں میں ان کی مخصوص علامتوں اور الفاظ کے سبب مناظر و کیفیات کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں اور یہ صورتیں ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں:

کھلتا تھا کبھی جس میں تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

یہ ڈوبتا سورج اور اس کی لبِ بام آمد
تاحدِ نظر اس کے آنچل کی بھڑک جائے

شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا منیر
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھل گیا

ہوائے شوق کے رنگیں دیار جلنے لگے

ہوئی جو شام تو جھکڑ عجیب چلنے لگے

اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشمے سے

اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

رات فلک پر رنگ برنگی آگ کے گولے چھوٹے

پھر بارش وہ زور سے برسی مہک اٹھے گل بوٹے

منیر نے اپنے ماحول کے سیاسی اور معاشرتی بحران کے پس منظر میں بھی بڑے خوبصورت اشعار کہے ہیں:

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے

کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

زمیں ہے مسکن شر آسماں سراب آلود

ہے سارا عہد سزا میں کسی خطا کے لیے

طوفان ابرو بار بلا ساحلوں پہ ہے

دریا کی خاشی میں ڈوبنے کا رنگ ہے

منیر نیازی ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اظہار و بیان اور اسالیب میں نئے نئے اور برمحل الفاظ کے شاعرانہ استعمال سے اسلوب کے امکانات میں مزید اضافہ کرنا چاہا۔ یہ کوششیں گو نظموں میں زیادہ ہوئیں لیکن بعض جدید غزل گو شاعر غزل کو اپنے عہد کے طرز احساس سے ہم آہنگ کرنے کے لیے الفاظ کے ضمن میں ہر طرح کے مناسب اور نامناسب تجربات کر رہے ہیں۔

یہ تجربات جب غزل کے مزاج سے یکسر مختلف ہوتے ہیں تو بہت گراں محسوس ہوتے ہیں، لیکن جن شاعروں نے غزل کے مزاج اور اس کے فطری حسن کو پیش نظر رکھتے ہوئے تجربات کیے ہیں وہ واقعی دلکش اور خوبصورت لگتے ہیں۔ منیر نیازی کے تجربات، جو وہ الفاظ کے سہارے کرتے رہے ہیں اس لیے بالعموم ناگوار محسوس نہیں ہوتے کہ وہ برمحل اور بامعنی ہوتے ہیں۔

میراجی کے رجحان سے قریب تر ایک اور رجحان ن۔م۔راشد کا ہے۔ انہیں کسی مکتبِ فکر سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور غزل کی طرف خصوصیت سے کبھی رجوع نہ ہوئے۔ ان کی شاعری میں روایت سے بغاوت کی واضح صورتیں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزل کی بیشتر روایتی علامات کو جو نظم میں شامل ہوگئی تھیں خارج کر دیا۔ انھوں نے چند غزلیں بھی لکھیں جو ان کے شعری مجموعے "ایران میں اجنبی" کی پہلی اشاعت (۱۹۵۷ء) میں شامل تھیں، لیکن اس کی دوسری اشاعت (۱۹۶۹ء) میں انہیں اس میں سے نکال دیا گیا۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس احساس کے ماتحت تھا کہ خود وہ بھی اسے اپنے لیے کبھی موزوں ذریعۂ اظہار نہیں سمجھتے تھے۔ "ایران میں اجنبی" کی پہلی اشاعت کے مقدمے میں انھوں نے خود ہی لکھا تھا کہ "جب بھی غزل کہی ہے بیشتر تقلیدی کہی ہے اور اس میں نسبتاً روایتی اندازِ بیان غالب رہا ہے" اور واقعہ بھی یہی ہے۔ گو غزل کے فطری حسن کی طرف وہ مائل ضرور ہوئے لیکن اس کے مزاج کے ساتھ مناسبت نہ رکھ سکے۔ چناں چہ ان کی غزلیں نہ پائیدار ہیں اور نہ ان میں کوئی دلکشی موجود ہے۔

## باب سوم

# پاکستانی غزل کی تشکیل

# پاکستانی غزل کی تشکیل

## انفرادی رویے

قیام پاکستان کے بعد غزل میں جو بالکل نئے رجحانات سامنے آئے وہ بڑی حد تک ناصر کاظمی، ابن انشاء باقی صدیقی اور حفیظ ہوشیار پوری وغیرہ کے طفیل تھے ۔ ان میں سب سے توانا اور بھرپور آواز ناصر کاظمی کی تھی ۔ انفرادیت کے لحاظ سے قیام پاکستان کے بعد کافی عرصے تک ناصر کاظمی، باقی صدیقی اور ابن انشا کی حدوں کو کوئی اور غزل گو نہ چھو سکا ۔ گو ناصر کاظمی (شعری مجموعے : برگ نے، دیوان، پہلی بارش، نشاط خواب) پر کلاسیکی اندازِ غزل گوئی اور اساتذہء فن کے اثرات واضح ہیں لیکن پھر بھی ان کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں رہی ہے ۔ انھیں یہ انفرادیت ان کے مخصوص اسلوب، خوبصورت اور موثر الفاظ کے استعمال، خوش آہنگ اور دلکش ترکیبوں، چھوٹی بحروں کے انتخاب اور تر و تازہ خیالات نے بخشی ہے ۔ دلکش اور موثر زبان و بیان کے لحاظ سے پاکستان کی اردو غزل کو کوئی اور ایسا غزل گو گزشتہ پچیس تیس سالوں میں نہ مل سکا ۔ چھوٹی بحریں دوسرے شاعروں مثلاً باقی صدیقی نے بھی خصوصیت سے اختیار کیں، لیکن ناصر کو لفظوں کے صوتی اثر سے بڑا فائدہ پہنچا ۔ اسی وجہ سے ان کے اندازِ بیان میں بلا کی سادگی نظر آتی ہے اور یہ کچھ اس رنگ

میر کا اثر بھی ہے جو اس طرح اسلوب میں بھی جھلکتا ہے ۔ مخصوص اسلوب، منفرد تراکیب اور خیالات کی تازگی ابن انشا کے ہاں بھی نمایاں ہے، لیکن یہ کبھی کبھی اجنبی اور نامانوس نظر آتی ہیں ۔ الفاظ کو مخصوص معنی دینے میں ناصر نے انتہائی فن کارانہ مہارت اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا ہے:

| | |
|---|---|
| خموشی انگلیاں چٹخا رہی ہے | تری آواز اب تک آ رہی ہے |
| کیا قیامت ہے کہ بے ایام گل | ہٹنیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے |
| تو نے بنجر زمیں کو پھول دیے | مجھ کو ایک زخم دل کشا ہی دے |
| دل ویراں میں دوستوں کی یاد | جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے |
| دھوپ کی جلتی تانوں سے | دشتِ فلک میں لگ گئی آگ |
| رنگ کھلے صحرا کی دھوپ | زلف گھنے جنگل کی رات |

ان کے اشعار میں گلی، شہر، صحرا، چاند رات، جنگل، دریا وغیرہ نئے مفہوم اور خاص پس منظر میں استعمال ہوئے ہیں ۔ اس لحاظ سے کلاسیکیت اور رومانیت کا جو حسین امتزاج ناصر نے پیش کیا ہے وہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہو سکا ہے ۔ ناصر کے پاس اظہار کا جو دلآویز سلیقہ تھا وہ جدید ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کی کلاسیکی اقدار سے بھی قریب تھا ۔ موضوعات میں ناصر نے ماضی کی یادوں، قیام پاکستان کے بعد ہجرت کے تاثرات، غم ذات اور غم روزگار کو زیادہ اہمیت دی ۔ ان موضوعات کے اظہار میں ان کی کامیابی شاید اس وجہ سے بھی ہے کہ ان کی شاعرانہ فکر کو مضبوط سماجی بنیادیں ملی ہیں اور داخلی فضا کی تعمیر اور عشقیہ واردات کے بیان میں ان کی شاعری نے نئے نئے

پہلو نکالے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی غزلیں تازہ نوائی اور فنی ریاضت کا پتہ دیتی ہیں:

پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو
جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں
پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
شہر در شہر گھر جلائے گئے یوں بھی جشن طرب منائے گئے
اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی
بے زاد سفر جیب تہی شہر نوردی
یوں میری طرح عمر کے دن بھر کے تو دیکھو
شہر کی بے چراغ گلیوں میں زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر اداسی بال کھولے سو رہی ہے
شام سے سوچ رہا ہوں ناصر چاند کس شہر میں اترا ہو گا

ناصر واقعتاً متنوع موضوعات کے شاعر تھے۔ انھوں نے زندگی کے حسن کے متعدد پہلوؤں اور اس کی رنگارنگی کو اپنے شعروں میں سمیٹا تھا۔ ان کی شاعری اپنی تمام دلکشیوں کے ساتھ ہمیشہ ارتقا پذیر رہی۔ "برگِ نے" کے مقابلے میں "دیوان" اور "دیوان" کے بعد ایک حد تک "پہلی بارش" اور

"نشاط خواب" کے ناصر کاظمی میں زیادہ تنوع اور دلکشی ہے۔ "برگِ نے" کی اداسی بعد میں گہرے ملال کی صورت اختیار کر گئی اور ذاتی رنج و الم میں ساتھیوں اور ہمسفروں اور ماحول کا دکھ بھی شامل ہوگیا ہے:

جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِشام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

کس سے کہوں کوئی نہیں، سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میت شہر بے کفن

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو سورج کرن کو ترسے گا

ناصر کاظمی کو جو لب و لہجہ ملا تھا۔ اس کی تشکیل میں میر سے لے کر فراق و یگانہ تک کا ایک سلسلہ موجود تھا۔ لیکن ناصر کی انفرادیت اپنی جگہ اس روایت سے منسلک رہنے کے باوجود انحراف کی ایک علامت بھی تھی۔ ان کے عہد میں باقی صدیقی کی آواز ضرور ان سے الگ رہی لیکن کچھ بعد میں احمد مشتاق اور پھر کسی حد تک شکیب جلالی وغیرہ سے لے کر بھارت کے کئی غزل گو شاعر تک ناصر کاظمی کی آواز سے آواز ملاتے رہے ہیں۔ بیان میں جو سادگی اور اختصار ناصر کے کلام کی نمایاں خصوصیت تھی، باقی صدیقی (شعری مجموعے: دار و رسن، زخم بہار، جام جم، بار سفر، کتنی دیر چراغ جلا) بھی اس لحاظ سے ان

کے ساتھ تھے ۔ لیکن شاید اس باب میں یہ نمایاں فرق بھی بہت ہے کہ باقی کے ہاں سادگی میں گہرائی اور وسعت کچھ زیادہ ہی ہے ۔ زبان و بیان پر قدرت اور اس سے کام لینے کا سلیقہ بھی ناصر سے کم نہیں تھا ۔ چھوٹی بحروں کو انھوں نے بھی خصوصیت سے اختیار کیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ناصر اور باقی میں اپنی اپنی انفرادیت باقی رہی ہے ۔ زبان کی سادگی، چھوٹی بحروں کے انتخاب اور بے ساختگی کے ساتھ باقی اپنے رنگ کے بہت اچھے اور منفرد شاعر تھے ۔ حیات و کائنات کا مشاہدہ اور تاثر باقی کی شاعری کا وصفِ خاص ہے اور اس وصف میں ان کے سلجھے ہوئے انداز کا بھی حصہ ہے ۔ ان کی غزلیں فن کی پابندی، روایات کے احترام اور اچھے اسلوب کی مثالیں ہیں ۔ بعض اوقات خیالات نئے نہ ہونے کے باوجود بھی پیرایۂ اظہار کی وجہ سے دلنشین اور اثر محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے :

یوں موت کے منتظر ہیں باقی — مل جائے گا چین جیسے مر کے
اے بادِ سحر نہ چھیڑ ہم کو — ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے
عشق میں نہ کچھ ملا باقی — اور دنیا کے کام سے بھی گئے

اور جہاں نئے خیالات ہیں وہاں وہ اپنے معاصر شاعروں سے بہت آگے نظر آتے ہیں ۔ پختگیٔ کلام اور ندرتِ اظہار کے ساتھ ساتھ انہیں ایجاز و اختصار پر بھی شاید اپنے دور میں سب سے زیادہ مہارت حاصل رہی :

یوں لرزتی ہے دل میں یاد تیری — جیسے پانی میں چاند کا پر تو
کس نے کھینچی حیات کی تصویر — ہاتھ میں جام پاؤں میں زنجیر

گزر گیا ہے محبت کا مرحلہ شاید
ترے خیال سے بھی دل نہ بے قرار ہوا

کوئی تو محفل گل کی بہار دیکھے گا
کلی کلی پہ لہو ہم نچوڑ آئے ہیں

زندگی بھاگ رہی ہے باقی
شوق کو آبلہ پا کیا دیکھیں

لے گیا ساتھ اڑا کر باقی
ایک سوکھا ہوا پتہ ہم کو

باقی کے متعدد اشعار اپنے اندر حیاتِ ابدی رکھنے کی بڑی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ یہ شاید احساس، گہرے غور و فکر اور مشاہدات کے نتیجے میں تخلیق ہوئے ہیں اور ان میں خیالاتِ تر و تازہ اور نکتہ آفرینی موثر ہے ۔ مثلاً :

ہم کہاں آئینہ لے کر آئے
لوگ اٹھائے ہوئے پتھر آئے

دل کے ملبے میں دبا جاتا ہوں
حادثے کیا مرے اندر آئے

جلوہ جلوے کے مقابل ہی رہا
تم نہ آئینے سے باہر آئے

دل سلاسل کی طرح بجنے لگا
جب ترے گھر کے مقابل آئے

جن کے سائے میں صبا چلتی تھی
پھر نہ وہ لوگ پلٹ کر آئے

دامن خواب کہاں تک پھیلے
ریگ کی موج کہاں تک جائے

ابھی ہے گوش بر آواز گھر کا سناٹا
ابھی کشش ہے بڑی دور کی صداؤں میں

غموں کی بھیڑ میں امید کا وہ عالم ہے
کہ جیسے ایک سخی ہو کئی گداؤں میں

سنگِ بنیاد ہیں ہم اس گھر کا
جو کسی طرح نہ تعمیر ہوا

عمر بھر جس کی شکایت کی ہے　　دل اسی آگ سے اسیر ہوا

تم زمانے کی راہ سے آئے　　ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا

زندگی کی آس بھی کیا آس ہے　　موج دریا پر دیا جلتا رہا

ہر ایک آدمی اڑتا ہوا بگولا تھا

تمھارے شہر میں ہم کس سے گفتگو کرتے

گونجتی تھی کہیں صدائے جرس　　قافلے دل سے رات بھر گزرے

کشتیاں ٹوٹ گئی ہیں ساری　　اب لیے پھرتا ہے دریا ہم کو

ابن انشا بھی اپنے انداز کے منفرد شاعر تھے۔ گو شاعری میں انھیں شہرت نظموں کی وجہ سے ملی لیکن ان کی غزلیں بھی انھیں ایک اچھے اور منفرد شاعر کی حیثیت میں سامنے لاتی ہیں۔ ان کے موضوعات زیادہ تر عشقیہ ہیں، لیکن ایک خاص اور دلکش کیفیت ان پر طاری رہتی ہے۔ لہجے میں مایوسی و محرومی، درد و الم اور بیزارگی کے ساتھ ساتھ شوخی و شرارت کا ایک انوکھا انداز ان کے لہجے اور اسلوب کو بہت پرکشش بناتا ہے۔ انھیں طویل بحریں اور ہندی الفاظ کا استعمال بڑا مرغوب تھا۔ جذبات و محسوسات کے اظہار میں سادگی اور معصومیت کی فضا ہر جگہ برقرار رہی اور اس میں وہ بڑے کامیاب رہے۔ یہ سادگی ان کے پیرایۂ اظہار کو بعض اوقات نثر سے قریب تر کر دیتی ہے۔ یہ بظاہر تو ایک کمزوری ہے لیکن ابن انشا نے اس انداز کو لطافتوں کا حامل بنا دیا ہے۔ ان کے اسلوب میں میر کی تقلید تو موجود ہے لیکن دونوں کے مزاجوں کا فرق بہر حال موجود ہے:

ان لوگوں کی بات کرو جو عشق میں خوش انجام ہوئے
نجد کے قیس یہاں کے انشا خوار ہوئے ناکام ہوئے

چاند نے کتنی باتیں کر لیں نکلا چمکا ڈوب گیا
ہم جو آنکھ جھپک لیں سو لیں اے دل ہم کو رات کہاں

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دو بھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

دلبر ہجر کے درد سے بوجھل ہے اب آن ملو تو بہتر ہو
اس بات سے ہم کو کیا مطلب یہ کیسے ہو یہ کیوں کر ہو

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

اس شخص نے یوں کون سا میدان ہنیں مارا
بس عشق کی بازی میں ہوئی مات عزیزو

کبھی ان کے ملن کی آشا نے اک جوت جگا دی تھی من میں
پر اب وہ اجالا سنو لایا پھر شام ہے من کے آنگن میں

اپنے اسلوب اور لہجہ کے لحاظ سے ابن انشا کی غزل اپنے معاصرین میں یکسر مختلف لیکن دلکش معلوم ہوتی ہے ۔ غزل میں ہندی زبان کے سبک اور مترنم الفاظ اور آہنگ سے ان کے علاوہ ناصر شہزاد (شعری مجموعہ :چاندنی کی پتیاں ) نے بھی انفرادیت پیدا کی ہے ۔ انھوں نے اسے ہندی کا مخصوص آہنگ دے کر اسے گیت کے قریب کر دیا ہے ۔ ان کی ایک ایسی غزل بہت

مشہور ہوئی جس کا مطلع یہ ہے:

چال کی شوخی روپ کی سج دھج جسم کا ہار سنگھار گیا
میرے پریم کا جادو اس کی سندرتا کو مار گیا

یا جیسے ان کی غزل کا یہ ایک شعر:

اپنی اپنی سادہ سجلتا اپنا اپنا لالچ لوبھ
پھول کی پنکھڑی پر بھونرا ڈنٹھل پر شہد کی مکھی ہے

ان دونوں شاعروں کے معاصرین میں کئی دیگر شاعروں نے بھی ہندی الفاظ کو خصوصیت کے ساتھ اپنی غزلوں میں استعمال کیا۔ شاد امرتسری (شعری مجموعہ: داغِ فراق)، قیوم نظر، اختر ہوشیار پوری (شعری مجموعہ: علامت) منیر نیازی، ناصر کاظمی کا نام اس سلسلے میں لیا جاسکتا ہے۔ یہ رجحان صرف اسی نسل تک محدود نہیں رہا بلکہ ان کے بعد کی نسلوں میں بھی اس رجحان کے شعوری اور غیر شعوری نمونے مل جاتے ہیں۔ ان شاعروں میں سے شاد امرتسری اور اختر ہوشیار پوری نے ہندی آہنگ کے حامل اسلوب سے ہٹ کر بھی اچھی غزلیں لکھیں۔

حفیظ ہوشیار پوری (شعری مجموعہ: مقام غزل) نے بھی قیام پاکستان کے بعد کے قریبی عرصے میں اپنی خصوصیت اور انفرادیت واضح کر دی تھی۔ گو وہ قیام پاکستان سے پہلے سے شاعری کر رہے ہیں، لیکن انھیں اہمیت اور مقبولیت بعد میں حاصل ہوئی۔ شگفتگی اور دلکشی ان کی غزلوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تخیل سے انھوں نے بہت کام لیا ہے اور غور و فکر کے نتائج

بھی ان کے اشعار میں جھلکتے ہیں ۔ پامال مضامین کو بھی انھوں نے اپنے اسلوب کی دلکشی سے نیا لطف عطا کیا ہے ۔ اظہار و بیان میں کلاسیکی قدروں کا رچاؤ بھی ان کے کلام میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ ان کے بعض اشعار بڑی توانائی اور تب و تاب رکھتے ہیں :

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

دل سے آتی ہے بات لب پہ حفیظ
بات دل میں کہاں سے آتی ہے

زندگی اور ماحول کے مسائل اور نشیب و فراز بھی حفیظ کے احساسات کو متاثر کرتے رہے ہیں ۔ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کا حسین امتزاج بھی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے اور یہ بڑے لطیف اشاروں اور علامتوں میں جھلکتی ہے :

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریہء شبنم نہ ہوں گے

یہ جہان زندگاں ہے کہ دیار کشتگاں ہے
کوئی دشمنوں کا مارا کوئی دوستوں کا مارا

نہ اب وہ ذوق طلب ہے نہ اب وہ عزم سفر
رواں ہے قافلہ تسکین راہبر کے لیے

میں اپنے حال کو ماضی سے کیوں کہوں بہتر
اگر وہ حاصل غم تھا تو یہ غم حاصل

دیگر شاعروں میں جو کلاسیکی اقدار پر کاربند رہے اور پاکستان میں اردو کے ممتاز اور بزرگ غزل گو شاعر کہے جاسکتے ہیں، زیڈ اے بخاری (ذوالفقار علی بخاری)، رئیس امروہی، اقبال عظیم، فضل احمد کریم فضلی اور سراج الدین ظفر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بخاری کو شاعر کی حیثیت سے وہ شہرت نہ ملی جو ان کے دوسرے معاصرین کے حصے میں آئی۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ وہ نہ تو خود شاعر کے طور پر شہرت کے طلب گار ہوئے نہ اپنے کلام کو جمع کیا، چناں چہ ان کا کوئی شعری مجموعہ تاحال شائع نہیں ہوا۔ زمانے نے بھی انہیں شاعر کی حیثیت میں زیادہ اہمیت نہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے جائزے میں، اپنی ان خصوصیات کے باوجود، جو ان کے کلام میں جابجا ملتی ہیں، یہ بہت کم شامل کیے گئے۔ بعض اشعار انھوں نے ایسے بھی کہے ہیں جو انھیں غزل گوئی کی تاریخ میں تادیر زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کی غزلیں نئے لہجے کی تلاش کا پتہ دیتی ہیں اور ان کا آہنگ اور اسلوب خاصہ مترنم ہے:

آبادیٔ دل کی ہے فقط ایک ہی صورت
بربادیٔ دل کے لیے سامان ہزاروں

سجدہ شوق کرے کون ادا میرے بعد

آپ پھرتے رہیں بن بن کے خدا میرے بعد

کچھ تو آئے نظر سراب سہی

کچھ تو انعام جستجو بھی ہو

رقص نمودیک دو نفس اور بھی سہی

دوش ہوا پہ مثل شرر ہوں ذرا ٹھہر

ہم نے فرہاد کو موضوع سخن ٹھہرایا

ذکر اپنا بہ حدیثِ دگراں لازم ہے

خواب امید کی تعبیر نظر آتی ہے

یہ بھی ثابت ہو اگر خواب تو پھر کیا ہو گا

فضلی بھی اپنے وقت کے ممتام شاعروں میں ہیں ۔ قیام پاکستان کے چند سال بعد ان کا شاعری مجموعہ "چشم غزال" شائع ہوا تھا، لیکن اس کے بعد تاحال پھر کوئی مجموعہ شائع ہنیں ہو سکا۔ ہمیشہ کلاسیکی طرزِ سخن اور روایات پر کاربند رہے اور تخیل اور جذبہ کو ان کے اشعار میں اہمیت حاصل رہی ۔ سادگی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے :

ادائیں ان کی سناتی ہیں مجھ کو میری غزل

غزل بھی وہ کہ جو میں نے ابھی کہی بھی ہنیں

دیکھ کر چونک اٹھتا ہوں

زندگی ہے کہ اک پریشاں خواب

برابر ہوک سی اٹھتی ہے دل میں

رہا کرتی ہے چہرے پر بحالی

رئیس امروہوی (شعری مجموعے :الف، پس غبار، حکایت نے) کی طرف نقادوں نے بالعموم کم توجہ دی ہے - اپنے معاصر شعرا میں پختگیِ فن، وسعتِ فکر اور اپنے مخصوص اسلوب کے سبب یقیناً انہیں اہمیت دی جانی چاہیے - ان کی غزلوں کا نمایاں موضوع فلسفہ اور اخلاق ہے، فلسفہ حیات کے نازک مسائل کو دلکش انداز میں بیان کرنے میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے:

جو زندگی سے بھی ہو وہ عاشقی کیا ہے

مگر سوال تو یہ ہے کہ زندگی کیا ہے

حرم میں معرفت کردگار پر تھی نزاع

صدا یہ دیر سے آئی کہ آدمی کیا ہے

ان کی غزل میں اسلوب کی حد تک روایات سے انحراف نمایاں ہے - ہمکلامی اور خود کلامی سے انھوں نے بہت کام لیا ہے - چند مثالیں دیکھیے:

ممکن ہے ذات کا اسی لمحے میں ہو ظہور

اک لمحہ کائنات سے قطع نظر کرو

عجب کیا ہے کسی پتھر میں شنوائی ابھر آئے

صدائے گم شدہ ہوں گھومتا ہوں کوہساروں میں

آہ کرتا ہوں تو چہرے پر ہے برسوں کا غبار

سانس لیتا ہوں تو سینے میں ہے صدیوں کی گھٹن

انفرادی رنگِ غزل میں سراج الدین ظفر (شعری مجموعہ : غزال و غزل) بھی مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں ۔ انھوں نے قدیم رنگِ شاعری میں اپنے دلکش اسلوب سے نئی جان ڈال دی تھی ۔ وسعتِ مشاہدہ، رفعتِ خیال اور لطافتِ بیان کے لحاظ سے ان کی غزلیں انتہائی کشش رکھتی ہیں ۔ ان کا اسلوب ایسا موثر اور بھرپور ہوتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والا بے اختیار جذب محسوس کرتا ہے ۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق، رندی و سرمستی سے لے کر معرفت اور حقیقت تک کے تمام موضوعات پائے جاتے ہیں ۔ زبان اس حد تک برجستہ اور ہموار استعمال کرتے ہیں کہ ایک دلکشی پیدا ہو جاتی ہے ۔ رندی و مستی اور مشاہدہ، ذات و کائنات کے مضامین، خوش آہنگ تراکیب اور برجستہ و بامعنی الفاظ کی ان کے کلام میں اس قدر بہتات ہوتی ہے کہ انھیں ان خصوصیات کی وجہ سے اردو میں حافظ کا پیرو خیال کیا جاسکتا ہے ۔ پاکستان میں غزل گوئی میں رنگِ حافظ کی اس مماثلت کے لحاظ سے ظفر اپنے انداز کے واحد اچھے شاعر ہیں ۔ موضوعات میں یکسانیت تو عدم کے کلام میں بھی مل جاتی ہے، لیکن اسلوب کی جو خصوصیات ظفر کے کلام میں موجود ہیں وہ انہیں حافظ کے زیادہ قریب لے جاتی ہیں ۔ ان کے کلام کے چند نمونے دیکھیے :

ہم اس جہاں میں تھے کل شب کسی کے ساتھ کہ لوگ
صبا کی طرح بھٹکتے جو جستجو کرتے

کیا سنواریں گیسوئے تحقیق حق
اور کھل جاتے ہیں جوں جوں باندھیے

تلاشِ دوست سحر کو کریں سپردِ نسیم
غزالِ صبح روانہ پسِ غزالہ کریں

عکسِ جمالِ یار بھی کیا تھا کہ دیر تک
آئینے قمریوں کی طرح بولتے رہے

پہلے تو خود کو عشق میں حل ہم نے کر دیا
پھر عشق کو شراب میں ہم گھولتے رہے

دشوار جو مقام تھا جبریل کے لیے
صرف ایک جست تھا مری تخیل کے لیے

یہ واقعہ ہے کہ ظفر نے پاکستان کی غزل میں ایک منفرد لہجے کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا پیرایہء اظہار صرف انہی کے ساتھ اس حد تک مخصوص رہا کہ یہ انہیں پر ختم بھی ہو گیا۔ ایک امتیاز انہیں یہ بھی حاصل ہوا کہ مشکل اور نامانوس الفاظ کے استعمال اور مشکل زمینوں کو اختیار کرنے کے باوجود انھوں نے اسے اپنے خوش آہنگ اسلوب سے جاذبیت اور دلفریبی عطا کی۔

شفقت کاظمی (شعری مجموعے: نغمہء حسرت، حسرت کدہ، داغِ حسرت) اور جعفر طاہر (شعری مجموعہ: گردِ سحر وغیرہ) بھی اس دوران قدیم روایتوں کے حسن اور فن کی نزاکتوں کے لحاظ کے ساتھ غزلیں کہتے رہے۔ شفقت کاظمی کا مزاج غزل سے بڑی مناسبت رکھتا تھا، لیکن جعفر طاہر نے نظم میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے طفیل زیادہ شہرت حاصل کی۔ پھر بھی غزل کو ان سے بعض اچھے شعر بھی ملے ہیں۔ جیسے:

پتھر کی مورتیں نظر آتی ہیں چار سو
یارب ترے جہان کو یہ کیا دفعتاً ہوا
ثمر آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
چھونے پائے نہ تھے کہ ہات کٹے

مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے شاعروں میں عندلیب شادانی کے بعد اقبال عظیم کو بزرگی کا درجہ حاصل ہوا ۔ شادانی کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہو گیا اور اقبال عظیم ۱۹۷۱ء سے کچھ قبل مشرقی پاکستان کے بحران کے دوران مغربی پاکستان آ گئے ۔ ان کے ساتھ ساتھ وہاں کے ممتاز غزل گو شعرا میں سے سرور بارہ بنکوی، احسن احمد اشک، نظیر صدیقی، مقبول نقش، عیش برنی وغیرہ بھی وہاں سے ہجرت کر کے مغربی پاکستان آ گئے ۔ چناں چہ اس طرح وہاں اب اردو غزل گوئی کا ایک یادگار دور ختم ہو گیا ۔

اپنے ملک کے حالات و مسائل کو بہت کم شاعروں نے اپنی غزل گوئی کا اس حد تک شریک بنایا ہے جتنا کہ اقبال عظیم (شعری مجموعہ : مضراب) نے ۔ ان کی شاعری کا ابتدائی دور اور ایک حصہ عشق و رومان کی کیفیات سے بھرپور ہے اور اس میں انھوں نے انتہائی حسین اور دلکش شعر کہے ۔ مثلاً :

دل کی دھڑکن کوئی درپردہ اشارہ تو نہیں
راز دارانہ کہیں اس نے پکارا تو نہیں
ہو طلسم عالم رنگ و بو کہ حریم انجم و کہکشاں
مرا ساتھ دے گی نظر مری وہ چھپیں گے جا کے کہاں کہاں

کب درد بڑھا کب ہوک اٹھی کیوں اشک بہا کیوں آہ کھنچی

تم گم ہو بہاروں میں اپنی تم غم کا فسانہ کیا جانو

اقبال عظیم کی غزل گوئی میں مختلف رنگ ملتے ہیں اور ہر جگہ دلکشی اور جاذبیت برقرار رہی ہے ۔ رومان، کیفیت نگاری اور معاملہ بندی ان کے کلام میں ہر دور میں مل جاتی ہے اور یہ اپنی جگہ پر لطف بھی ہے ۔ جیسے؛

یہ نہ ہو پھر آپ غیروں میں ہمیں رسوا کریں

آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے یہیں کہہ جائیے

بچ بچ کے گزر جاؤ ہو تم پاس سے میرے

تم تو بخدا غیروں کو بھی مات کرو ہو

چمکے تو ہے سورج کی طرح روپ تمھارا

لیکن یہ سمجھ رکھیو سورج بھی ڈھلے ہے

ہم زباں سے کچھ کہیں تو آپ کا شکوہ بجا

کوئی آنسو لب کشا ہو جائے تو ہم کیا کریں

کیفیت نگاری اور عشقیہ موضوعات کے علاوہ زندگی کے تلخ مسائل سے بھی اقبال عظیم نے بہت اثر قبول کیا ہے ۔ چناں چہ اس کے اثرات ان کے کلام میں متعدد صورتوں میں نظر آتے ہیں ۔ مثلاً؛

اب ہم بھی سوچتے ہیں کہ بازار گرم ہے

اپنا ضمیر بیچ کے دنیا خرید لیں

اپنی بے نوری کا ہم اقبال ماتم کیا کریں

آج کے حالات میں دیدہ وری بھی جرم ہے

اک آہ تو کر لی ہے مگر سوچ رہا ہوں

پہچان نہ لی ہو مری آواز کسی نے

زہر کے گھونٹ بھی ہنس ہنس کے پیے جاتے ہیں

ہم بہرحال سلیقہ سے جیے جاتے ہیں

ان احساسات سے قطع نظر اقبال عظیم نے ملکی سیاست کے نشیب و فراز، مشرقی پاکستان کے المیے اور پھر ہجرت کے تاثرات کو بڑے دل سوز انداز میں اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے ۔ درج ذیل اشعار اپنے میں موجود محسوسات اور ان کے پس منظر کو خود بیان کرنے کے لیے کافی ہیں:

تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے

بے سبب گردش ایام کو الزام نہ دو

تم نے پیغام کا مفہوم غلط سمجھا تھا

مقصدِ صاحبِ پیغام کو الزام نہ دو

بدلنا ہے تو رندوں سے کہو اپنا چلن بدلیں

فقط ساقی بدل جانے سے میخانہ نہ بدلے گا

خود اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی مانگو

پرائے گھر کے چراغوں کا آسرا نہ کرو

منزل تو خوش نصیبوں میں تقسیم ہو چکی

کچھ خوش خیال لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

اور ہر چیز بدل ڈالی چمن والوں نے

بس غریب الوطنی اپنی جگہ باقی ہے

جہاں بھی ہم نے صدا دی یہی جواب ملا

یہ لوگ کون ہیں پوچھو کہاں سے آئے ہیں

سرور بارہ بنکوی (شعری مجموعے : سنگِ آفتاب، سوز گیتی) مشرقی پاکستان کے معروف اور ممتاز غزل گو شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری زندگی کی تلخیوں اور رعنائیوں دونوں سے عبارت ہے اور وہ سلیقے سے اپنی بات ادا کرتے ہیں، جس میں فکر، تخیل اور جذبہ سب ہی کچھ موجود ہوتا ہے :

کٹ تو جائے گی ترے غم کے سہارے زندگی

اور اگر اے دوست تیرے غم سے جی گھبرا گیا

یہی نہیں کہ مرا دل ہی میرے بس میں نہ تھا

جو تو ملا تو میں خود اپنی دسترس میں نہ تھا

افسر ماہ پوری اور نظیر صدیقی (شعری مجموعہ : حسرتِ اظہار) نے اگرچہ اپنی صلاحیتوں کو کبھی پورے طور پر شاعری کی طرف متوجہ نہیں کیا، افسر ماہ پوری دیگر ادبی مشاغل میں مصروف رہے اور نظیر صدیقی ایک اعلیٰ درجے کے نقاد کی حیثیت سے بلند پایہ اور ٹھوس مقالات لکھتے رہے، لیکن پھر بھی ان دونوں کے کلام میں بعض بہت عمدہ اشعار ملتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شاعر خیال و فکر کے نئے نئے پہلوؤں کی تلاش میں رہے ہیں :

یہی تو سوچ کر ہم ان کی محفل سے چلے آئے

ہماری خاموشی کی کچھ نہ کچھ تعبیر بھی ہو گی

کیا بتائیں حال دل ان کی شناسائی کے بعد

جس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پروائی کے بعد

ایک مدت پر خیال ان کا کہاں سے آگیا

کتنی اچھی انجمن لگتی ہے تنہائی کے بعد

---افسر ماہ پوری

بچھڑ کر تم سے دل کی بزم آرائی نہیں جاتی

مگر یہ کیا کہ ملتے ہو تو تنہائی نہیں جاتی

رات سے شکایت کیا بس تمہی سے کہنا ہے

تم ذرا ٹھہر جاؤ رات کب ٹھہرتی ہے

امیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے بجھ گئے آخر

مگر یہ کیا کہ بزم آرزو برہم نہیں ہوتی

باقی ہے فقط قاتل و مقتول کا رشتہ

جس سمت جہاں دیکھیے مقتل کی فضا ہے

وہ قیامت جو سر سے گزری ہے

دیکھیے کب شعور سے گزرے

---نظیر صدیقی

نظیر صدیقی نے سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے محسوسات اور مشاہدات شعر کے اسلوب میں بیان کیے ہیں ۔ انھوں نے زندگی کے تلخ حقائق کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اور جس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اس

کا ایک اندازہ ان کے موخر الذکر شعر سے ہو سکتا ہے جو المیہء مشرقی پاکستان کے نتیجہ میں کہا گیا ہے ۔ اس المیے پر کئی شاعروں نے اپنی شدتِ احساس کو غزل کا روپ دیا ہے اور یہ موضوع سقوط کے بعد ایک عرصے تک شاعروں کے احساسات میں موجزن رہا ہے :

جس آئینے میں جوانی کے خواب دیکھے تھے
وہ گر کے ٹوٹ گیا عمر رائیگاں کی طرح
نکل گیا ہے بدن سے جو روح کی مانند
وہ میری جان تھا اک یار مہرباں کی طرح
۔۔۔یوسف ظفر

لڑتے ہیں کب کسی کے لیے دوسروں کے ہاتھ
اپنے ہی بازوؤں میں توانائی چاہیے

کس طرح ہار گئے رازِ شکست افشا ہو
ہم پہ کیا بیت گئی ہم کو بتایا جائے
۔۔۔عدیم ہاشمی

کیسے کہیں غیروں نے ہی تاراج کیے گھر
اپنوں میں بھی ایسے تھے جو معصوم نہیں تھے
ہمارے پاؤں کے چھالوں کو دیکھتے کیا ہو
ہماری روح میں اتری ہوئی تھکن دیکھو

کچھ تو ترکہ چاہیے تھا وارثوں کے واسطے
اپنے پیچھے ہم نے حقِ خوں بہا رہنے دیا
جو قتل ہوئے ان سے زیادہ ہیں کہیں وہ
غفلت کی صلیبوں پہ جو مصلوب ہوئے ہیں
---اختر لکھنوی

کانٹوں کی تکلیف بھلا دی پھولوں کی جاں سوزی نے
اپنوں نے جو زخم دیے وہ زخم بہت ہی گہرے ہیں
وہ گئے گھر کی رعنائیاں بھی گئیں
یوں لگا جیسے دیوار و درد سو گئے
جیسے زعمِ خود سے ہم ڈوبے
ایسے دنیا میں لوگ کم ڈوبے
ناخداؤں پہ اعتماد کیا
کتنی بے چارگی سے ہم ڈوبے
---اعجاز رحمانی

موجودہ دور میں حبیب جالب اور اقبال عظیم کے بعد غالباً اعجاز رحمانی (شعری مجموعہ :کاغذ کے سفینے) واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنی نظموں کے علاوہ غزلوں میں قومی اور سیاسی مسائل اور نشیب و فراز کی کیفیات کو بہت خلوص اور بہت وضاحت کے ساتھ جگہ دی۔

## عصری تقاضے

قیام پاکستان کے بعد فیض، ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور باقی صدیقی وغیرہ نے غزل میں جو روایتیں تشکیل دیں، ان پر چل کر کئی اور ذہین شاعروں نے اپنے خیالات اور تجربات سے غزل میں مفید اور خوشگوار اضافے کیے اور جدید عہد کے تقاضوں کو اپنی غزلوں میں بڑی عمدگی سے سمونے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ایسے جدید شاعروں نے جذبہء احساس کو نیا روپ دیا، نئے نئے خیالات بیان کیے، نئے استعارے استعمال کیے اور نئی علامتوں کی جستجو کی۔ ان کی وجہ سے اسلوب، اظہار اور طرزِ ادا میں بھی انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کی بنیاد پر آج کی جدید غزل استوار ہوئی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے شاعروں میں، جو کسی مخصوص رجحان اور تحریک سے وابستہ نہیں رہے، عزیز حامد مدنی، شان الحق حقی، جمیل الدین عالی، مصطفیٰ زیدی وغیرہ متعدد نام ہیں جو غزل گوئی میں ممتاز ہوئے۔

عزیز حامد مدنی (شعری مجموعہ : دشتِ امکاں) نے ابتداً نظمیں لکھ کر شہرت حاصل کی تھی، لیکن دراصل وہ غزل کے زیادہ اچھے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں فکر کی پختگی اور جذبے کی کیف آوری اور نزاکتِ احساس کی خوبیاں عام طور پر ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے بعض اشعار بہت دلکش اور پائیدار ہیں:

ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
ہم ایک حلقہء وحشت اثر میں ہوتے ہیں

وہی ہیں آج بھی اس جسم نازنیں کے فسوں
جو شاخ گل میں جو موج گہر میں ہوتے ہیں
بہت نازک ہے اس نوخیز کا آئین آرائش
حیا پہلے سے بڑھ کر اور سر ناخن حنا کم کم

اور خاص طور پر ان کی ایک غزل کے یہ اشعار:

فراق سے بھی بچ گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیش ملال سے بھی گئے
چراغ بزم ابھی جان انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خط و خال سے بھی گئے
وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزم خیال سے بھی گئے

شان الحق حقی (شعری مجموعہ : تار پیراہن) اپنے معاصرین میں اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے غزل کی روایت میں بڑی توانائی اور تازگی کا اظہار کیا ہے۔ غزل کی روایت اور اس کے مزاج کے وہ بہت قریب رہے ہیں، چناں چہ انھوں نے غزل گوئی میں روایتوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اسلوب اور طرزِ ادا میں بعض نہایت خوشگوار تجربے کیے ہیں اور غزل کی پختہ اور مسلمہ تراکیب، اشارات اور اسالیب سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ جذبات اور خیال دونوں میں ان کے ہاں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

سر ہے تو ہو ہی جائے گا سودا کسی کے ہاتھ

دل ہے تو مل ہی جائے گا ناوک فگن کوئی

بڑی تلاش سے ملتی ہے زندگی اے دوست

قضا کی طرح پتہ پوچھتی نہیں آتی

خوب نقشہ ہے مرے فکر کی جولانی کا

کوئی کم بخت اسیری میں جواں ہو جیسے

اب دسترس شوق ہے بس نام تک اس کے

اکثر جسے سو طرح لکھے بن نہ رہا جائے

یہ نکہتِ زلف آئی دم خواب کدھر سے

پہنچا یہ مرا آ ہوئے بیتاب کدھر سے

بساط آرزو تصویر صحرا ہو گئی آخر

وہ ہنگاموں کی بستی ، ہو کی دنیا ہو گئی آخر

جمیل الدین عالی (شعری مجموعے : غزلیں دوہے گیت - لاحاصل) کو شہرت ان کے دوہوں کی وجہ سے ملی، لیکن انھوں نے غزلوں میں خیال، جذبہ اور ذہانت کی بڑی دلکش مثالیں پیش کی ہیں - ان کا انداز بہت سادہ اور بے ساختہ اور خیال بہت واضح ہوتا ہے، مثلاً :

تم ایسے کون خدا ہو کہ عمر بھر تم سے

امید بھی نہ رکھوں نا امید بھی نہ رہوں

عمر بھر کے لیے کافی ہے وہی ایک جھلک
تم کو لازم ہنیں ہر شے سے نمایاں ہونا

میری ہنگامہ پسندی پہ نہ الزام رکھو
شاید اک یہ بھی علاج غم تنہائی ہے

کچھ نہ تھا یاد بجز کار محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

ہر ایک یورش دوراں کو سہہ رہی ہے حیات
ہزار بار چھلک کر بھی جام ہے لبریز

مصطفیٰ زیدی (شعری مجموعے : روشنی، گریباں، موج مری صدف صدف، کوہِ ندا، قبائے ساز، شہرآذر) بھی ویسے تو اپنی زیادہ بہتر صلاحیتوں کا اظہار نظم میں کرتے رہے، لیکن انھوں نے بعض عمدہ غزلیں بھی تخلیق کیں۔ اسلوب میں بعض مقامات پر ان کا رنگ انفرادی نظر آتا ہے مگر موضوعات روایتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے بعض اشعار بہت جاذبِ توجہ ہیں:

سینے میں خزاں آنکھوں میں برسات رہی ہے
اس عشق میں ہر فصل کی سوغات رہی ہے

آندھی چلی تو نقش کف پا ہنیں ملا
دل جس سے مل گیا وہ دوبارہ ہنیں ملا

دیکھ اے دشتِ جنوں بھید نہ کھلنے پائے
ڈھونڈنے آئے ہیں گھر کے درو دیوار مجھے

اب جی حدودِ سود و زیاں سے گزر گیا

اچھا وہی رہا جو جوانی میں مر گیا

بھلا کہاں کے ہم ایسے گمان والے ہیں

ہزار بار ہم آئیں ہمیں بلاؤ بھی

مت پوچھ کہ ہم ضبط کی کس راہ سے گزرے

یہ دیکھ کہ تجھ پر کوئی الزام نہ آیا

ان شاعروں کے معاصرین میں وہ شاعر بھی ہیں جو قدیم روایاتِ سخن کو عزیز رکھتے ہوئے جدید رجحانات کے اثرات بھی قبول کرتے رہے ہیں ۔ اس طرزِ سخن کے حامل غزل گو شاعروں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو مستقل مزاجی سے اپنی مخصوص صلاحیتوں، خصوصیات اور ایک حد تک اپنے اپنے انفرادی رنگ کے ساتھ غزل گوئی میں مصروف رہی ہے ۔ ان شاعروں مثلاً نعیم صدیقی (شعری مجموعہ : شعلۂ خیال وغیرہ)، تابش دہلوی (شعری مجموعہ : نیم روز)، محشر بدایونی (شعری مجموعے : شہر نوا، غزل دریا)، فروغ احمد شاعر لکھنوی (شعری مجموعہ : زخم ہنر)، راز مرادآبادی (شعری مجموعہ : حرفِ راز)، قمر جلالوی (شعری مجموعہ : اوجِ قمر)، اثر جلیلی، اختر انصاری اکبرآبادی (شعری مجموعے : غم فردا، لبِ گفتار وغیرہ)، اقبال صفی پوری، ہاشم رضا، صہبا لکھنوی، راسخ عرفانی (شعری مجموعے : خلش خار، محفل امکاں وغیرہ)، ضمیر جعفری (شعری مجموعہ :مافی الضمیر وغیرہ)، اختر ہوشیارپوری، حافظ لدھیانوی (شعری مجموعہ : خامۂ مژگان)، صبا اکبرآبادی (شعری مجموعہ : اوراق گل)،

نازش حیدری (شعری مجموعہ : صدیوں کا سفر)، مجیب خیرآبادی وغیرہ میں سے کئی شاعروں کا غزل گوئی میں اپنا مخصوص لب و لہجہ ہے اور بعض شاعروں کے کلام میں عصری آگہی، جدید رجحانات اور مختلف پہلوؤں سے بعض تجرباتی کوششیں بھی ملتی ہیں ۔ موضوعات اور رجحانات بھی متنوع ہیں اور اسلوب میں بعض شاعروں نے دلکشی اور جاذبیت پیدا کرنے کی کوششیں بھی کی ہے ۔ ان میں سے بعض شاعروں نے چند بہت اچھی غزلیں اور ان میں کئی اچھے شعر تخلیق کیے ۔ مثلاً :

سبک سبک کبھی گزرے ہیں وہ صبا کی طرح
کبھی برس گئے جذبوں پہ وہ گھٹا کی طرح
اذیتوں کا تسلسل عقوبتوں کا سموم
یہ زندگی ہے کسی جرم کی سزا کی طرح
---نعیم صدیقی

ہم خس و خاشاک آوارہ گزر گاہوں کا بوجھ
رقص کرتے تیرے کوچے کی ہوا میں آئے ہیں
ہر پتی بوجھل ہو کے گری سب شاخیں جھک کر ٹوٹ گئیں
اس بارش ہی سے فصل اجڑی جس بارش سے تیار ہوئی
چھوتی ہے ذرا جب تن کو ہوا چبھتے ہیں رگوں میں کانٹے سے
سو بار خزاں آئی ہو گی محسوس مگر اس بار ہوئی
---محشر بدایونی

ہر ایک دل ہے یہاں خاک و خوں میں غلطیدہ
زمین کوچہء جاناں ہے سرزمین وطن
ہم آئنیہ ہیں مگر عکس ذات سے محروم
تری صدا ہیں مگر ناشنیدہ ہیں ہم لوگ
---راز مرادآبادی

ہجر کی راہ میں کسے معلوم
رہ گیا عالم وصال کہاں
حدودِ جلوہء رخ تک تو کچھ سراغ ملا
پھر اس کے بعد نگاہوں کا سلسلہ گم ہے
مزاج عشق کو اک رنگ اعتدال بھی دے
دیا ہے ہجر تو اندیشہء وصال بھی دے
تمام عمر مری جس کے ہجر میں گزری
وہ ایک پل بھی مری ذات سے جدا نہ ہوا
کہیں پہ رنگ کہیں روشنی کہیں آواز
نظر سے تابہ نظر سیکڑوں مقام آئے
---شاعر لکھنوی

اپنے دامان دریدہ کو جو مڑ کر دیکھا
ہر دریچہ میں نظر آئی زلیخا مجھ کو

وہ اہل کہف تھے جن کو ضیا ملی آخر
مرا یہ دور کہ اب تک اندھیرے غار میں ہے
راسخ کبھی پہاڑ بھی سر سے گزار دوں
ہوتا ہوں مضطرب کبھی لمحوں کی چوٹ سے
برق چمکی کھل گیا بیداد ظلمت کا بھرم
جتنے چہرے ہم نے دیکھے جانے پہچانے لگے
---راسخ عرفانی

شکستِ شوق کا احساس انگ انگ میں تھا
اک آئینہ کی طرح میں دیارِ سنگ میں تھا
خرد آئینہ تھی آبِ رواں تھی
اب اس پہ کائیوں کی تہ جمی ہے
کام آسکی نہ ایک بھی دیوار ضبط کی
گزرا ہے دل کو توڑ کے دریا ملال کا
اگر امید کو چھوڑا تو ہر طرف ہے سراب
کہ اس دریچہ سے دریا نظر بھی آتا ہے
---نازش حیدری

تمھاری بزم سے اٹھ کر عجیب حال ہوا
ہر ایک شکل مجھے اجنبی سی لگتی ہے
---اختر انصاری اکبرآبادی

آبِ گہر کے تشنہ دہن سارے مر گئے
ہم سے یہ واقعہ لبِ ساحل کہا گیا
مجھ کو سنا کے میری ہی آوازِ بازگشت
کس کس کو میرا مدِمقابل کہا گیا

---تابش دہلوی

دل وہی عہدِ ملاقات پرانا چاہے
اور زمانہ کہ پلٹ کر ہی نہ آنا چاہے

---اقبال صفی پوری

اہل چمن کو جرأتِ پرواز بھی نہ تھی
پتہ کہیں جو کھڑکا تو دل ڈوبنے لگا

---حافظ لدھیانوی

منظر سمندروں کا بڑا دلفریب تھا
لیکن تہوں کا راز جو منجدھار میں کھلا
پھول سے ترشے ہوئے لوگ خوابوں میں کہاں
دشتِ وحشت میں کوئی آبلہ پا ہی ہو گا

---اختر ہوشیارپوری

جس میں کبھی کبھی اتر آتی تھی چاندنی
دیوار میں وہ روزن در بھی نہیں رہا

درد میں لذت بہت اشکوں میں رعنائی بہت

اے غمِ ہستی ہمیں دنیا پسند آئی بہت

---ضمیر جعفری

یہ وہ شاعر ہیں جن کا طرزِ احساس اور اسلوب قیام پاکستان کے بعد ابھرا اور اس نے عام توجہ حاصل کی - ان میں سے کئی شاعروں کا فن تا حال عروج پر ہے، مگر بعض شاعر جن روایتوں پر شعر کہتے رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے حصار سے باہر نکل نہ سکے - اس وجہ سے ایسے شاعروں کا فن جس ارتقا تک پہنچ سکا تھا یا تو وہیں رہا یا اس سے بھی نیچے اتر گیا - ان میں سے چند شاعر بلاشبہ ایسے بھی ہیں جو عصری تقاضوں کو بھی اپنے فن اور اپنی شاعری میں جگہ دیتے رہے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی غزلیں زندگی اور پائیداری کی صفات اور خصوصیات سے آراستہ ہوتی جارہی ہیں - ان شاعروں کے معاصر شاعروں میں متعدد ایسے نام نظر آتے ہیں جنھوں نے دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ غزل کو بھی بطور خاص اختیار کیا، ان میں سے چند شاعر تو ایسے ہیں جو قیام پاکستان کے بعد بہت جلد غزل گوئی میں ممتاز سمجھے جانے لگے تھے اور بعض شاعر کچھ عرصہ بعد اس صف میں شمار ہوئے - یہ شاعر ایک طویل عرصے سے غزل گوئی میں اپنے مخصوص اسلوب کو برت رہے ہیں اور جدید طرزِ احساس کے نتیجے میں غزل کے دامن کو نت نئے خیالات، افکار اور جذبات سے مالا مال کر رہے ہیں - پھر ان شاعروں کو ان کے رجحانات اور طرزِ ادا کے سبب بالعموم جدید غزل گو قرار دیا جاتا ہے - ان شاعروں میں جن کی ایک بہت بڑی تعداد

ہے اور جو معروف اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ نام یہ ہیں: شہرت بخاری (شعری مجموعہ : طاق ابرو)، انجم رومانی، رضا ہمدانی، جمیل ملک (شعری مجموعے : سرو چراغاں، پردہ، سخن)، خاطر غزنوی، رفعت سلطان (شعری مجموعے : ایمن، آواز اظہار)، عرش صدیقی (شعری مجموعہ : دیدہ، یعقوب)، سجاد باقر رضوی (شعری مجموعہ : تیشہ، لفظ)، احمد ظفر (شعری مجموعہ : دل دو نیم)، میرزا منور (شعری مجموعہ : غبار تمنا) وغیرہ۔ ان شاعروں میں سے بعض نے بہت دلکش غزلیں لکھیں اور عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ اپنے فن کی ارتقائی کیفیت کا اچھا مظاہرہ کیا۔ موضوعات کے لحاظ سے ان شاعروں کے کلام میں خاصہ تنوع اور انفرادیت بھی موجود ہے۔ ان کے ہاں حیات و کائنات کا پرتو بھی جھلکتا ہے۔ اور عرفان ذات کی متعدد منزلوں کے طے کرنے کا رجحان اور خیال اور جذبے میں نزاکتیں پیدا کرنے اور اسلوب کو نکھارنے کی واضح کوششیں ان شاعروں کے اشعار میں نظر آتی ہیں، جیسے:

نکہت تھی ڈھلی نور کی کیا اس کا بیاں ہو
پوجوں تو خدا ہاتھ لگاؤں تو صنم ہے

سوئے تو ہم آغوش رہے ہم ترے غم سے
جاگے تو حریف غم دنیا نظر آئے

تو کون تھا کیا تھا کہ برس گزرے پہ اب بھی
محسوس یہ ہوتا ہے رگ جاں کی طرح تھا

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

---سجاد باقر رضوی

اک ذرا سی بات پر، برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

کسی نے دل میں نہ جھانکا کہ دل کے دکھ سنتا
سبھی نے بات سنی چشم و ابرو و لب کی
---خاطر غزنوی

مہرباں ہو ہی گئے ہو تو ندامت کیسی
آگئے ہو تو نہ آنے کی وضاحت کیسی

دل سے پوچھو کہ یہ حسرت کش ساماں کیوں ہے
جس جگہ غم کا گزر ہے وہ بیاباں کیوں ہے

بے فیض نہیں اتنا بھی آئینۂ دنیا
خود ہم نے چڑھا رکھا ہے زنگارِ تمنا
---شہرت بخاری

ہوا ہے معرکہ میرا جو شب کے منظر سے
اندھیرا ٹوٹ کے برسا ہے میرے اندر سے
---احمد ظفر

تمام عمر اسی کی تلاش میں گزری
وہ ایک عکس جو آئینۂ نظر میں نہ تھا

وہ آگ جس کا شرارہ نفس کی حد میں ہے
اب ایک لاش ہے جو جسم کی لحد میں ہے
---رضا ہمدانی

پیچ در پیچ سلسلے دل کے
مجھے تیری تجھے کسی کی تلاش
اس شہر کے باسی دل کے دیے شب کو بھی بجھا کر رکھتے ہیں
کن گلیوں ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں حسن صداقت کی خوشبو
---جمیل ملک

ہم اپنی شکستوں سے ہیں جس طرح بغل گیر
یوں قبر سے بھی کوئی ہم آغوش نہ ہو گا
ویرانۂ حیات میں آسودہ خاطری
کس کو ملا اس آہوے رم خوردہ کا سراغ
---انجم رومانی

## مخصوص لب ولہجہ

ان شاعروں کے علاوہ ان کے معاصرین میں وہ شاعر جنھوں نے ناصر کاظمی، باقی صدیقی اور پھر شان الحق حقی، عزیز حامد مدنی کے دورِ غزل گوئی کے بعد اپنے منفرد اسلوب اور متنوع اور نت نئے موضوعات سے غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ اور دل کشی و توانائی دینے کی کوشش کی۔ ان میں سے منیر نیازی کا ذکر ہو چکا ہے ۔ ان کے علاوہ سلیم احمد، ظفر اقبال اور پھر احمد فراز اور شکیب جلالی کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان میں سے سلیم احمد اور ظفر اقبال نے اپنی غزلوں میں چونکا دینے والے اسلوب کو اختیار کیا ۔ ان دونوں نے غزل کے مروجہ مزاج اور اسلوب سے ہٹ کر اپنے لیے علیحدہ راستوں کا

انتخاب کیا۔ سلیم احمد (شعری مجموعہ : بیاض) نے خیال آرائی اور قدرے طنز و ظرافت سے اپنی غزل میں انفرادی رنگ پیدا کرنا چاہا تھا۔ لیکن ان کے لیے اس طرح لوگوں کو چونکانا اور تجسس پیدا کرنا تو ممکن ہوگیا، مگر اس انداز میں شعریت اور تغزل کی خصوصیات پڑھنے والوں کو مشکل ہی سے ملتی ہیں۔ مثلاً :

دل حسن کو دان دے رہا ہوں
گاہک کو دکان دے رہا ہوں

ہے ہوس کو بھی دعویٔ ایثار
چور کہتا ہے میں ہوں ساہو کار

چست صدری پہن کے بیٹھے ہیں
دل کی مسند پہ عشق کے جذبات

تری جانب سے دل میں وسوسے ہیں
یہ کتے رات بھر بھونکا کیے ہیں

گاہک کا کال دیکھ کے دھندا بدل دیا
کھولی تھی پہلے ہم نے بھی جذبات کی دکاں

ویسے اس سے انکار ممکن نہیں کہ سلیم احمد نے بعض بہت عمدہ شعر تخلیق کیے ہیں اور اب یوں لگتا ہے کہ ان کی غزلیں گہرے غور و فکر کے نتیجے میں تخلیق ہوتی ہیں۔ اس نوعیت کے اشعار ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں :

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

مجھے حرفِ غلط سمجھا تھا تو نے
سو میں معنی کا دفتر ہو گیا ہوں

کب تلک الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتا رہوں
زندگی دی ہے تو دے اس کو کوئی مفہوم بھی

تجھے میں اپنی محبت سے ہٹ کے دیکھ سکوں
یہاں تک آنے میں مجھ کو کئی زمانے لگے

وہ حرفِ تازہ جو گل سا کھلے کہاں سے ملے
کہ زخم بھر گئے اور درد سب پرانے لگے

لیکن سلیم احمد کا بیشتر کلام ایسا منتخب نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ اب تازہ غزلوں میں وہ اپنے سابقہ چونکا دینے والے انداز سے بچ کر بہت دور نکل آئے ہیں اور اب ان کی غزل کا دامن ان کی تحیّر خیز غزل کے دامن سے وسیع ہے۔

ظفر اقبال کا معاملہ ان سے مختلف رہا۔ ان کی غزل گوئی کا آغاز کلاسیکی لہجہ میں جدید طرزِ احساس کے ساتھ ہوا تھا اور ان کے پہلے شعری مجموعے "آبِ رواں" کی غزلیں ان کے اچھے امکانات کی طرف اشارہ کرتی تھیں، لیکن ان کے دوسرے شعری مجموعے "گلافتاب" کی غزلیں غزل کی روایات اور زبان سے شعوری بغاوت کے پہلو کو نمایاں کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل کو نئی لسانیاتی تشکیل کے ذریعے نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ لیکن ان کی یہ کوشش بالعموم موضوعات سے دور رہ کر اسلوب کی سطح پر ابھری ہے۔ اس میں شک

ہنیں کہ انھوں نے تخلیقی تجربے کے ذریعے کچھ نئی صورتیں اور کچھ نئے انداز وضع کیے ہیں ۔ وہ ان مقامات پر جہاں خارجی فضا اور ماحول کو اپنی ذات میں سمیٹ کر ان کی ترجمانی کرتے ہیں تو اس طرح وہ بعض بہت اچھے شعر کہہ جاتے ہیں ۔ مثلاً ان کا یہ انتہائی دلکش شعر:

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نے ملے اور ہم کو تو نہ ملا

یا پھر یہ اشعار:

ہمارے سر میں بھی سکھ منزلوں کی خاک اڑی
ہمارے پاؤں میں بھی سلسلے سفر کے رہے

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

کیا ہوں ظفر اندھیرے اجالے کی جنگ میں
دن سا مرے وجود میں یہ ڈوبتا ہے کیا

ذاتی یاس اور محرومی اور ماحول کے انتشار اور بحران میں ان کی علامتیں مختلف روپ دھارتی ہیں ۔ کہیں اس قسم کی علامتیں زندگی اور اس کے مفہوم سے بہت قربت رکھتی ہیں اور کہیں بہت دور اور مصنوعی معلوم ہوتی ہیں ۔ اسی طرح ظفر اقبال نے لسانیاتی تشکیل کے توسط سے جو تجربات

کیے ہیں وہ کہیں تو ذہن کے لیے قابل قبول ہوتے ہیں اور کہیں شدید طور پر ناگوار لگتے ہیں۔ پھر اس سے اکثر مقامات پر ابہام اور الجھاؤ محسوس ہوتا ہے۔ ایسی کچھ مثالیں دیکھیے:

ساحلوں سونے سیہ تھے پانیوں پایاب تھے
دور کے دریا بظاہر سبزیء سیلاب تھے

بے عکس بے درخت وہی شام ہر طرف
ٹوٹیا ہو یا پڑیا تھا مرا نام ہر طرف

کالے کٹھور عکس ہوس پڑھ ہواؤں کے
آئے ہنا کے عرصہء محشر کی دھوپ میں

اندھا دھند انداز اندرے اندر
طلب تیرگی کا تکونا سمندر

تمنا طائفہ تصویر تلچھٹ
محبت مسخرا دربانے کا

شعری دنیا میں ظفر اقبال کی اٹھان بہت پر امید تھی اور انھوں نے بعض بہت دلکش غزلیں کہیں، لیکن اب وہ ان چند غزل گو شاعروں میں ہیں جو غزل کی روایتوں سے شدت کے ساتھ انحراف کرتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب اس سابقہ شدت میں قدرے کمی آرہی ہے اور ان کے اشعار میں جاذبیت کا عنصر پھرا ابھر رہا ہے۔

لسانی تشکیل کے لحاظ سے غزل میں بعض دیگر شاعروں مثلاً منیر نیازی، سید افضل جعفری، ظہیر فتح پوری اور جدید شاعروں میں ناصر شہزاد، علی اکبر

عباس، جاوید شاہین، پرتو روہیلہ اور محمد اظہارالحق وغیرہ نے بھی مختلف نوعیت کے تجربات کیے ہیں۔ لیکن ان میں منیر نیازی اور شیرافضل جعفری کے علاوہ بہت کم شاعروں کے تجربات ایسے ہیں جو پرکشش اور متوازن ہوں۔ ظہیر فتح پوری اور ناصر شہزاد نے اس ضمن میں زیادہ تر ہندی الفاظ کے استعمال سے کام لیا ہے۔ لیکن دوسرے شاعروں نے زیادہ تر نامانوس اور یکسر اجنبی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں بعض شاعر مقامی الفاظ اور علاقائی زبانوں کے الفاظ کو بھی ارادتاً غزل میں شامل کر رہے ہیں، لیکن اس طرح جو کامیابی شیرافضل جعفری کے حصے میں آئی ہے وہاں تک کوئی اور شاعر غالباً ابھی تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ انھوں نے غزل کو مقامی رنگ و آہنگ سے آشنا کرتے ہوئے لفظوں کی نئی تشکیل کا جو کام لیا ہے وہ ناگوار نہیں بلکہ پرکشش اور متوازن ہے۔ مثلاً:

ٹھکورے پر خوشی کی ہچکیوں کے
غمِ ایام کو رقصا رہا ہوں

دل کے چھلکتے راوی کو
ڈونگھا کر گہرائی دے

کبھی کبھی جو غزل ناریاں مچلتی ہیں
مری نگاہ میں چنگاریاں مچلتی ہیں

سوہنے ہونٹوں پہ ہے پانوں کی آگ
پی رہے ہیں پھول ارمانوں کی آگ

سلیم احمد اور ظفر اقبال کے مقابلے میں احمد فراز اور شکیب جلالی نے چونکا دینے والے موضوعات سے قطع نظر اپنے دلکش انداز، نزاکت احساس، فکر و خیال، جذبہ اور گہرے مشاہدہ کے ذریعے اردو غزل کو نئی وسعتوں اور امکانات سے آشنا کیا۔ احمد فراز (شعری مجموعے: تنہا تنہا، دردِ آشوب، شبِ خون، نایافت، جاناں جاناں) کو اپنے دور میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ انہیں یہ شہرت اور مقبولیت غزل میں ان کی اپنی انفرادیت کی وجہ سے حاصل ہوئی جو نفاست، سلیقہ اور کیف و سرور کے اوصاف اور نئے مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے انہیں ملی ہے۔ ان کی غزل کا آہنگ بہت مدھم ہے اور انھوں نے منطقی و جذباتی وجود کو آپس میں خلط ملط کر کے اسے ایک کیفیت کے طور پر اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے ذہنی تقاضوں کو سمجھا ہے اور زندگی کا مطالعہ ان زاویوں سے کیا ہے جو عصری شعور کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس طرح انھوں نے غزل میں نئے مزاج کی جھلک دکھائی ہے۔ یہ مزاج جمالیاتی اور عشقیہ اظہار میں بھی رنگ آمیزی کے ذریعے نمایاں ہوا ہے اور اس لیے پرکشش محسوس ہوتا ہے۔ اس مزاج کے تحت فراز نے اپنے مخصوص اسلوب سے غم جاناں میں غم دوراں کو سمیٹ لیا ہے اور اس وجہ سے ان کی غزلیں زیادہ پر اثر اور بامعنی ہو گئی ہے:

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

یوں معلوم ہوتا ہے کہ فراز کلاسیکی شاعروں میں غالب اور اپنے معاصرین میں فیض اور احمد ندیم قاسمی سے متاثر ہیں۔ جمالیاتی اور عشقیہ بیان کی رنگ آمیزی میں فیض کا اثر جھلکتا ہے اور اسلوب کے ساتھ ساتھ خیالات بھی، جیسے:

مٹ جائے گی مخلوق تو فریاد کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے
---فیض

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے
---فراز

ندیم قاسمی کا اثر ان کے ہاں مدھم آہنگ اور منطقی اور جذباتی رجحان کو آپس میں ایک دوسرے میں ضم کرنے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور معاصرین سے بھی خیالات میں اتفاق نظر آتا ہے۔ مثلاً فارغ بخاری کے اور ان کے ایک شعر کی مماثلت کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ لیکن ان اثرات کے باوجود فراز کا غزل گوئی کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ ان کے معاصرین میں

بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جو سلیقہ، مہارت اور عمدگی اور کلاسیکی اقدار کے ساتھ شعر کہہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد میں فراز نے اپنی غزلوں سے دلفریب اور خوشگوار اضافہ کیا ہے۔ ان کے چند منتخب اشعار دیکھیے:

قربتوں میں بھی جدائی کے بہانے مانگے
دل وہ بے مہر کے رونے کے بہانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

شمع کی لو تھی کہ وہ تو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

وہ خار خار ہے شاخ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

تڑپ اٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں
میں زخم زخم ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

ہم دشت تھے کہ دریا ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ستم کے عہد میں چپ چاپ جی رہا ہوں فراز
سو دوسروں کی طرح باضمیر میں بھی نہ تھا

اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

فراز کے ہمعصر غزل گو شاعروں میں شکیب جلالی (شعری مجموعہ: روشنی اے روشنی) بھی نئی نسل میں بہت مقبول ہوئے۔ انھوں نے موضوعات اور اسلوب دونوں میں جدید اور انفرادی رنگ پیدا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی، لیکن ۱۹۶۶ء میں المناک خودکشی نے ان کی مزید کامیابی کے امکانات کو ختم کر دیا۔ ذاتی کرب اور دل کی ویرانی کے احساس کو شکیب نے ماحول کی کیفیات کا روپ دے کر بہت دلنشین اور پرتاثیر رنگ دیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

سرخی نہیں پھولوں کی تو زخموں کی شفق ہے
دامان طلب ہم کبھی سادہ نہیں رکھتے

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مرجھا کے آگرا ہوں مگر سرد گھاس میں

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

شکیب نے استعاروں اور علامتوں کا بڑا سہارا لیا تھا۔ یہ سب علامتیں اور استعارے ان کے دور میں جدید شاعروں کے احساسات اور خیالات کی دنیا میں کافی مروج اور مقبول تھے۔ لیکن شکیب نے انسانی زندگی اور اس کے ماحول کے رشتوں اور عناصر کو بالکل نئے انداز سے دیکھا اور انہیں نئے معنی دیے۔ ان کا یہ انداز ان کے معاصرین میں بھی مقبول اور عام ہو رہا تھا۔ اس قسم کے اسلوب سے غزل میں داخلیت اور خارجیت اور غم جاناں اور غم دوراں کی حدیں آپس میں اس طرح گلے مل رہی تھیں کہ معنی کی کئی سطحیں ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

احمد فراز، شکیب، سلیم احمد اور ظفر اقبال اپنے عہد کے نمائندہ غزل گو کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں غزل گو شاعروں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو اسی طرز احساس اور جدید ذہنی کیفیات کے ساتھ تخلیق شعر میں حصہ لیتی ہے۔ ان میں شہزاد احمد، احمد مشتاق، ساقی فاروقی، ناصر شہزاد، مظفر علی سید، اطہر نفیس، مشفق خواجہ، فرید جاوید، صادق نسیم، محبوب خزاں،

محسن احسان، انجم اعظمی، امید فاضلی، جون ایلیا، عبدالرؤف عروج، جمیل یوسف، حفیظ صدیقی، محب عارفی، احمد ہمدانی، محسن بھوپالی، پرتو روہیلہ، سحر انصاری، توصیف تبسم، مظفر وارثی، مرتضیٰ برلاس، منظر ایوبی، عالمتاب تشنہ، افتخار عارف، قمر جمیل، صہبا اختر، رسا چغتائی، رضی اختر شوق، رئیس فروغ، سرشار صدیقی، شبنم رومانی، ذوالفقار تابش، صلاح الدین ندیم وغیرہ کے نام قیام پاکستان کے پندرہ بیس سالوں میں نمایاں ہوئے۔ اس فہرست میں ناموں کی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بعض شاعر قیام پاکستان کے وقت ہی سے شعری دنیا میں پہچانے جا رہے تھے۔ لیکن انھوں نے اہمیت بعد میں حاصل کی اور ان میں سے کئی شاعر روز افزوں ارتقائی مراحل طے کر رہے ہیں۔ مگر بعض ایسے شاعر بھی ہیں جن کا فن اب ایک مرحلہ پر پہنچ کر رک گیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایسے شاعروں نے جدید سے جدید تر رجحانات کی تلاش میں بے معنی اور بے سر و پا موضوعات اور حد سے زیادہ غیر مانوس لہجہ اختیار کرنا چاہا۔ لیکن یہ باتیں ایسی تھیں کہ شاعر انہیں خود زیادہ برت نہ سکے اور بوجھل اور ناخوشگوار شاعری نے خود انہیں بھی تھکا دیا یا بعض شاعر عصری شعور اور مزاج کا ساتھ نہ دے سکے اور اس طرح جاذبیت اور کشش ان کے کلام سے عنقا ہو گئی۔ ان میں سے وہ شاعر جو صحت مند رجحانات اور پر کشش اسلوب کے ساتھ شاعری کرتے رہے ان میں شہزاد احمد، احمد مشتاق اور ساقی فاروقی ممتاز ہیں۔ یہ ان جدید غزل گو شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے مفہوم کے اعتبار سے واضح اور ستھرے مضامین غزل میں شامل کیے۔ شہزاد احمد (شعری مجموعے: صدف، جلتی بجھتی آنکھیں، ادھ کھلا دریچہ)

اور ساقی فاروقی (شعری مجموعہ : پیاس کا صحرا) نے غزل میں ذات کی تلاش کو کافی اہمیت دی ہے :

آدمیت ہے کہ ہے گنبدِ بے در کوئی
ڈھونڈھنے نکلوں تو اپنا بھی نہ رستہ پاؤں
خود اپنے آپ کا احساس کب رہا ہے مجھے
میں اس لیے ہوں کہ اک شخص دیکھتا ہے مجھے
---شہزاد احمد

میں تو خدا کے ساتھ وفادار بھی رہا
یہ ذات کا طلسم مگر ٹوٹتا نہیں
---ساقی فاروقی

ان دونوں شاعروں کی غزل میں جذباتی اور نفسیاتی حقیقتوں کی ایک مخصوص دنیا نظر آتی ہے - یہ شاعر انسانی خواہشات اور معاشرہ سے ان کے تعلق کو موضوع بناتے ہوئے نئے نئے رنگوں کی تصویریں کھینچتے ہیں - زندگی کی جذباتی تشنگی اور نفسیاتی ہیجان کی انھوں نے واضح ترجمانی کی ہے :

دل میں وہ آباد ہے جس کو کبھی چاہا نہ تھا
چور سے ڈرتے تھے لیکن گھر کا دروازہ نہ تھا
خود ہی مل بیٹھے ہو یہ کیسی شناسائی ہوئی
دشت میں پہنچے نہ گھر چھوڑا نہ رسوائی ہوئی
اس بھرے شہر میں آرام میں کیسے پاؤں
جاگتے چیختے رنگوں کو کہاں لے جاؤں

پیرہن چست ہوا مست کھڑی دیواریں
اسے چاہوں اسے روکوں کہ جدا ہو جاؤں

دن نکلتے ہی وہ خوابوں کے جزیرے کیا ہوئے
صبح کا سورج مری آنکھیں چرا کر لے گیا

میں کہ خوش ہوتا تھا دریا کی روانی دیکھ کر
کانپ اٹھتا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر

پتھر نہ پھینک دیکھ ذرا احتیاط کر
ہے سطح آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا

شب ڈھل گئی اور شہر میں سورج نکل آیا
میں اپنے چراغوں کو بجھاتا نہیں پھر بھی

---شہزاد احمد

بیکار اس کے واسطے آنکھیں ہوئیں تباہ
یہ لوگ آنسوؤں سے گرفتار کب ہوئے

عمر بھر کانٹوں میں دامن کون الجھاتا پھرے
اپنے ویرانے میں آ بیٹھا ہوں دنیا دیکھ کر

ناموں کا اک ہجوم سہی میرے آس پاس
دل سن کے ایک نام دھڑکتا ضرور ہے

سپردگی میں نہ دیکھی تھی تمکنت ایسی
یہ رنج ہے کہ انا کا شکار میں بھی تھا

ہم تنگنائے بحر سے باہر نہیں گئے

تجھ سے بچھڑ کے زندہ رہے مر نہیں گئے

راستہ دے کہ محبت میں بدن شامل ہے

میں فقط روح نہیں ہوں مجھے ہلکا نہ سمجھ

ہر گئے دور کی پوشاک پہن لی میں نے

جاں مہذب نہ ہوئی میں تھا برہنہ ایسا

---ساقی فاروقی

احمد مشتاق (شعری مجموعہ : مجموعہ) نے شاعرانہ منظر آفرینی میں بڑی دلکشی پیدا کی۔ ناصر کاظمی اور منیر نیازی نے بھی منظر آفرینی کی خوبصورت کوششیں کی تھیں، لیکن احمد مشتاق کی غزلوں میں یہ کوشش ذہن و تخیل کی سحر سازی اور اثر انگیزی کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ احمد مشتاق نے رومانی جذبات اور لطیف احساسات کو بہت دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اسلوب میں دلفریبی اور سادگی ہے۔ مثلاً:

اب تک ہے وہی عالم دل کا وہی رنگِ شفق وہی تیز ہوا

وہی سارا منظر جادو کا مرے نین سے نین ملائے ہوئے

جن پہ بچھتی تھی کبھی گہرے خنک سایوں کی سیج

ان منڈیروں سے لپٹ جاتی ہے اکثر چاندی

لبھاتا ہے اگرچہ حسن دریا ڈر رہا ہوں میں

سبب یہ ہے کہ اک مدت کنارے پر رہا ہوں میں

ترے آنے کا دن ہے تیرے رستے میں بچھانے کو
چمکتی دھوپ میں سائے اکٹھے کر رہا ہوں میں
یہ جھونکے جن سے دل میں تازگی آنکھوں میں ٹھنڈک ہے
انہی جھونکوں سے مرجھایا ہوا شب بھر رہا ہوں میں
کوئی کمرہ ہے جس کے طاق میں اک شمع جلتی ہے
اندھیری رات ہے اور سانس لیتے ڈر رہا ہوں میں

سادگی اور حسن بیان کے لحاظ سے احمد مشتاق نے بہت اچھی غزلیں کہی ہیں - اس لحاظ سے انھوں نے ناصر کاظمی کے اثرات کو بہت زیادہ قبول کیا ہے پھر بھی ان کا اسلوب ان کا اپنا ہی معلوم ہوتا ہے - اس میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ہے اور یہ خصوصیت ان کے معاصرین میں اس خوبصورتی کے ساتھ بہت کم شاعروں کو حاصل ہوئی ہے - اس کی چند مثالیں دیکھیے؛ پہلے دو شعر میر کے رنگ کی کامیاب تقلید میں ہیں:

وہ جو ایک وقفۂ عمر تھا تری آرزو میں بسر کیا
کبھی منتظر رہے شام کے کبھی انتظارِ سحر کیا
کبھی سال سال نہ طے ہوئیں کسی نقش پا کی مسافتیں
کبھی ایک لمحۂ شوق میں کئی منزلوں کا سفر کیا
ایک مدت اسے دیکھا اسے چاہا لیکن
وہ کبھی پاس سے گزرا تو بلایا نہ گیا
خیر بدنام تو پہلے بھی بہت تھے لیکن
تجھ سے ملنا تھا کہ پر لگ گئے رسوائی کو

ان کے معاصرین میں رومانی جذبات اور عشقیہ واردات کو خوبصورت اور دلکش اسلوب اور حسین روپ دینے والوں میں ناصر شہزاد کا نام خصوصیت رکھتا ہے۔ سیدھے سادے جذبات کو انھوں نے ہندی زبان کے الفاظ اور آہنگ کے سہارے بیان کرنے میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر ان کے کلام میں متنوع اسلوب بھی اپنی دلکشی کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً:

جلنا مرا تو خیر مقدر کی بات ہے
تم یوں ہی ساتھ ساتھ مرے عمر بھر جلے

میری مانند کبھی گوشۂ تنہائی میں
دل کے دکھ تو نے بھی رو رو کے نکالے ہوں گے

کچھ دیر تو ٹھہر جا اے ساعت گریزاں
پھر کوئی دیکھتا ہے مجھ کو بڑی لگن سے

دیوی ہے تو نہ مجھ میں ہیں پیغمبروں کے وصف
مت سٹپٹا کے اٹھ مرے عرض سوال پر

دیکھوں تجھے تو روح کا صحرا سلگ اٹھے
چاہوں تجھے تو تیری لگن میں مٹھاس ہے

ناصر شہزاد کو اپنے معاصرین میں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے غزل میں دیہات کی فضا کا رنگ روپ شامل کیا ہے۔ ہندی الفاظ اور آہنگ سے دلچسپی غالباً اسی کا ایک پہلو ہے۔ ان کے مقابلے میں اگر شہری زندگی کا گھریلو پن کسی خصوصیت کے ساتھ کسی نے غزل میں بیان کیا ہے تو وہ ظفر

اقبال ہیں۔ لیکن جدیدیت کے رجحانات کے لحاظ سے بھی یہ دونوں شاعر بہت ممتاز اور نمایاں ہوئے۔ ناصر شہزاد نے ہندی آہنگ کے لحاظ سے بعض اچھے اور جاذب توجہ تجربے کیے ہیں۔ لیکن ان کے تجربے جب انگریزی الفاظ، جدید تہذیب اور شہری زندگی کو اختیار کرنے کے درپے ہوئے تو آہنگ کا حسن رکھنے کے باوجود جاذب نظر نہیں کہے جاسکتے، جیسے:

رومال پر تھے پھول کڑھے پات شال پر
دیکھا تھا میں نے کل اسے اک بک سٹال پر

شیشے کے کارنس پہ دھرا ہے یہ کس کا پتر
نکلس گلے میں زلف مہکتی ہے گال پر

جدید غزل گوئی میں اس قسم کا ایک رجحان بہت واضح ہوتا جارہا ہے جسے "واقعیت نگاری" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس رجحان کے تحت بعض جدید شاعر اپنے ماحول، معاشرت اور صورتِ حال سے متعلق اشیا مثلاً گاڑی، ٹیکسی، سڑکیں، فٹ پاتھ، ٹیلیفون، پیالی، لڑکا، لڑکی وغیرہ استعمال کر رہے ہیں۔ حالاں کہ غزل کا مزاج واقعیت کے بجائے رمزیت یا علامت کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔ اس قسم کی مثالیں مختلف شاعروں کے کلام میں ملتی ہیں:

خالی پڑی ہیں بید کی بیمار کرسیاں
خاکستری سی دھند برستی ہے لان پر

گھر والی کے واسطے بچی نہ پیالی چائے کی
کتے بلی آن کر کھا گئے کیک مٹھائیاں

ڈبل ڈیکریں سی پس و پیش تھیں
نہ جانے لگی کس طرف سے ٹکر
---ظفر اقبال

آپ ناصر ذرا رہیں خاموش
ایک گاڑی گزر رہی ہے ابھی
نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے
---ناصر کاظمی

بی اے کر کے رہ گئے لونڈے کے دو کام
تنہا بیٹھے ریڈیو ، ساتھ ملے تو تاش
---انجم رومانی

رات آئی ہے بچوں کو پڑھانے میں لگا ہوں
خود جو نہ بنا ان کو بنانے میں لگا ہوں
---اکبر حمیدی

دودھ جیسا جھاگ ، لہریں ، ریت اور یہ سیپیاں
جن کو چنتی پھر رہی ہیں موتیوں سی لڑکیاں
---حسن اکبر کمال

دن چڑھا گلی آباد ہوئی بڑھیوں کی جمی چوپال بھلا
گودوں میں پوتے، پوتیوں کی کبھی ناک بہے کبھی رال بھلا
---علی اکبر عباس

جدید غزل میں خاص طور پر ایسے تجربات جو الفاظ سے تعلق رکھتے ہیں، بہت اہم ہیں۔ علاقائی زبانوں بالخصوص پنجابی زبان کے الفاظ مناسب اور نامناسب دونوں صورتوں میں استعمال کرنے کا جو تجربہ کیا جارہا ہے، ممکن ہے کہ یہ کبھی کبھی مناسب محسوس ہو، لیکن اس قسم کی کوششوں کی وجہ سے غزلیں بعض اوقات پڑھنے میں اچھی ضرور لگتی ہیں۔ مگر صرف خوش آہنگی سے کوئی شعر اچھا نہیں ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور بعض صورتوں میں موضوعات کے تعلق سے کچھ دوسرے تجربات بھی، جیسے منیر نیازی، وزیر آغا اور مجید امجد وغیرہ کی غزلوں میں نظر آتے ہیں، نہ شعر میں خوبی پیدا کر سکتے ہیں نہ تاثیر۔ اور پھر جب اس قسم کے تجربات غزل کے بنیادی مزاج اور موضوع اور اسلوب کے تعلق سے ہوں تو یہ کسی طرح بھی جاذبیت اور شاید مقبولیت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ چناں چہ یہی ہوا، مزاج اور معنویت کے لحاظ سے صلاح الدین محمود نے جس نوع کی غزلیں لکھیں وہ ناقابل فہم اور ابہام کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً؛ ان کی مختلف غزلوں کے یہ چند شعر:

ہوا چلی ننگی اجیالی طائر اگتے ڈالی ڈالی
جلے جلائے سمتوں کے تن تاروں کی بجھتی رکھوالی

شجر کے بھیتر چہاتی چڑیا سمتوں کو دہراتی چڑیا
ننھی نازک کالی رنگت شجر سفیدہ پانی چڑیا

ہوا کی چتون جیسے نین ہونٹوں پہ شبنم سے بین
لانبا جسم سمندر جیسا سورج جس کے بھیتر چین

بھارت کے بعض جدید شاعروں نے تو غزل کی ہئیت میں بھی ایک انقلابی تجربہ کرنے کی کوشش کر ڈالی اور غزل کو آزاد غزل کے نام سے آزاد نظم کی ہئیت اور اسلوب میں لکھنا شروع کیا۔ اس کی ابتدا وہاں مظہر امام نے کی تھی، مگر حال ہی میں (۱۹۷۹ء) مدراس سے علیم صبا نویدی کا آزاد غزلوں کا پہلا مجموعہ "ردِ کفر" شائع ہوا ہے۔ لیکن یہ تجربات اور تبدیلیاں ایسی ہیں کہ انھیں ابھی تک مقبولیت حاصل نہیں ہوئی کیوں کہ اس میں ہئیت کے لحاظ سے انوکھا پن تو ہے مگر تغزل کی کیفیت ابھی اس میں پیدا نہیں ہو سکی۔

## رجحانات کا تنوع

چوں کہ جدید غزل جدید ذہنی کیفیات اور جدید طرزِ احساس کی پیداوار ہے، اس لیے اس میں ایک نئی فضا اور ایک نیا آہنگ نظر آتا ہے۔ ایسی غزل پرانی علامتوں اور قدیم سانچوں کے بجائے تازہ علامتوں اور الفاظ اور آہنگ کے نئے سانچوں کی تلاش میں ہے۔ اسی طرح جدید غزل کے لیے علامتوں کے مسئلے نے بھی خاص اہمیت اختیار کر لی ہے۔ بعض نئے شاعروں نے نئی علامتوں کی جستجو کی تھی، مگر غزل میں عموماً پرانی تلمیحات اور پرانے اشارے ہی مؤثر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ زبان میں سادگی اور بیان میں اجمال کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں، مگر بڑے شاعروں سے قطع نظر، اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ غزل ان بلاغتوں سے محروم ہوتی جارہی ہے جو پرانی غزل کا امتیاز تھا۔ جدید شاعروں کے ہاں بیان کے جملہ سانچے اور اسالیب کمزور ہوتے جارہے ہیں اور مناسب لفظ و تراکیب ان شاعروں کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتی جارہی

ہیں ۔ الفاظ کی شیرینی اور روزمرہ و محاورے جن سے غزل کی ایمائیت میں حسن پیدا ہوتا ہے، جدید شاعروں کے کلام میں خال خال نظر آتے ہیں ۔ علامتوں کے رشتے سے بیشتر جدید شاعروں نے اپنے ماحول کی اشیا، مظاہر اور معاشرت سے اپنا تعلق قائم کیا اور یوں اپنے ماحول سے علامتیں اخذ کرنے کا ایک واضح رجحان عام ہوا ۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس عرصے میں اس قسم کے رجحان کو غزل میں رواج حاصل ہوا وہ بڑی حد تک نظم کی مقبولیت کا زمانہ تھا ۔ وہ بہت سے حسی تصورات اور اشیا جو نظم میں مقبول ہوئی تھیں، غزل میں بھی استعمال ہونے لگیں اور یوں یہ سب عناصر غزل میں بھی داخل ہو گئے ۔ لیکن متعدد نئے شعراء جو پاکستان کے پندرہ بیس سالوں میں ابھرے، غزل کے علامتی اسلوب کو مزید مستحکم کر رہے ہیں ۔ وہ مانوس اور غیر مانوس اشیاء کے علامتی امکانات کو بروئے کار لا رہے ہیں اور یہ عمل برابر فروغ پا رہا ہے ۔ چناں چہ اس اعتبار سے دورِ حاضر کی غزل گوئی میں اردگرد کے ماحول کی عکاسی بھی اہمیت اختیار کر رہی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود جدید عہد کے بیشتر اچھے شاعروں نے غزل کے مخصوص رمزیاتی اور ایمائی طریق کار کو ملحوظ رکھا ہے ۔

اطہر نفیس اور فرید جاوید چند سالوں کے عرصے میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے ۔ فرید جاوید کی شہرت زیادہ عام نہیں ہوئی تھی، لیکن رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے ۔ ان کا شعری مجموعہ " سلسلہ تکلم کا " ان کی وفات کے بعد (۱۹۸۰ء میں) شائع ہوا ۔ اطہر نفیس کا شعری مجموعہ " کلام " ان کی

زندگی میں (۱۹۷۶ء) شائع ہو گیا تھا۔ یہ دونوں شاعر بڑے نازک احساسات کے حامل تھے۔ لہجے کی نرمی اور سادگی کے لحاظ سے فرید جاوید اور دکھ بھرے لہجے کی وجہ سے اطہر نفیس اپنے معاصرین میں خاص انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں نے بعض بہت خوبصورت شعر کہے۔ فرید جاوید کا یہ شعر:

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

اور ان کے یہ دوسرے شعر:

میکدے میں سب کچھ ہے صرف پوچھنا یہ ہے
میکدہ میسر ہے کتنے بادہ خواروں کو

زندگی کو بہت عزیز ہوں میں
ڈھونڈ لیتے ہیں حادثات مجھے

سکوت نیم شبی ہے کہ ڈھل رہی ہے شراب
یہ چاندنی ہے کہ تیرے خیال کا سایہ

کرم کی آس کے سائے میں بجھ گیا وہ چراغ
ہوائے یاس کے جھونکے جسے بجھا نہ سکے

ان کے فن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اطہر نفیس نے وارداتِ قلبی اور زیادہ تر عشقیہ جذبات کے اظہار پر اپنی شاعری کو مرکوز رکھا، لیکن اس طرح کہ یہ ان کے اشعار میں زندگی کے حقائق کی صورت میں سامنے آتے ہیں:

عشق فسانہ تھا جب تک اپنے بھی بہت افسانے تھے
عشق صداقت ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا

اک آگ غم تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا ڈھلتا ہو پھر دامن دل کو بچائیں کیا

واردات قلبی اور درد انگیز مضامین کے علاوہ اطہر نے بعض نئے موضوعات پر بھی شعر کہے ہیں۔ ایسے مقامات پر انھوں نے غزل کے حسن اور اس کی روایتوں کا پورا لحاظ رکھا ہے اور اپنے تجربات و محسوسات کو اپنی انفرادیت کی تشکیل کا ایک اہم ذریعہ بنایا ہے۔ یہ تجربات و محسوسات بھی اطہر کے خود اپنے ہیں:

میں اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کو کیا چاہوں
مجھی پہ ختم ہے قصہ مری محبت کا

دروازہ کھلا ہے کہ کوئی لوٹ نہ جائے
اور اس کے لیے جو کبھی آیا نہ گیا ہو

یہ دھوپ تو ہر رخ سے پریشان کرے گی
کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ

چاند پھر نکلا ہے یارو درد میں ڈوبا ہوا
پھر مجھے سونے نہ دے گا دل مرا جاگا ہوا

پھر مرے سر سے ٹلی نامہرباں سورج کی دھوپ
پھر تری یادوں کا مجھ پر دور تک سایہ ہوا

سوئیں تو جگا دینے کے لیے وہ یاد یار نگار بہت
جاگیں تو سلا دینے کے لیے افسون لب و رخسار بہت

اس عرصے میں اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ غزلیں کہنے والوں میں مشفق خواجہ (شعری مجموعہ :ابیات) کا نام ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ روایات کے حسن اور احساس کی وضع داری کا جو رچاؤ ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے وہ ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہے۔ اپنی ذات اور احساسات کے اظہار کے لیے انھوں نے مخصوص علامتوں اور استعاروں کو مثلاً آئینہ، دروازہ، کھڑکی، کمرہ، دستک وغیرہ کو خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ تنہائی کا احساس اور ایک افسردگی سی بالعموم ان کی غزلوں پر طاری رہتی ہے اور کہیں کہیں میر کا اثر و انداز بھی جھلکتا ہے۔ جیسے:

اس کلبۂ احزاں سے ہرگز ابھرے گا نہ سورج کوئی بھی
کب خاک ستارہ بار ہوئی کب سائے سحر آثار ہوئے

تم اپنے گھر کے اندھیرے میں کیا دیکھتے ہو دیواروں کو
یہ شمع کی صورت جلنا کیا آئے گی ہوا بجھ جاؤ گے

مشفق خواجہ کی غزلیں شدتِ احساس اور ندرتِ فکر کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان میں حسن و عشق کی متنوع کیفیات، جذبات، خیال و فکر اور نازک و لطیف احساسات کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں اور اسلوب سادہ اور دلنشیں رہتا ہے:

اداس راتوں میں تیم سلگتی صبحوں میں
جو غم گسار تھا کوئی تو دیدہ۔ تر تھا

گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جائے

تنہائی نے دیواروں پہ وہ نقش گری کی
لگتا ہے کسی اور کا گھر اب تو گھر اپنا

کبھی ہوا ہے کبھی روشنی کبھی دستک
عجیب سایہ سا اک میرے گھر میں رہتا ہے

یہ بخل کیا ہے خداوند آسمان و زمیں
ہر ایک سمت ہے تو اور میں کہیں بھی نہیں

نہ جانے زیست کے کس دور سے گزرتا ہوں
کہ تیرے روپ میں خود کو تلاش کرتا ہوں

تنہائی، افسردگی اور خودآگاہی ان کے کلام کے بنیادی اوصاف ہیں اور لہجے کا دھیما پن ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔

مظفر علی سید نقاد کی حیثیت سے ممتاز ہیں، لیکن غزلیں بھی کہتے ہیں۔ ان کی غزلیں زندگی کی اعلیٰ اقدار، روایت کی پاسداری اور زندگی کے گہرے تجربے و مشاہدے کے نتیجے میں تخلیق ہوتی ہیں۔

ساغر صدیقی (شعری مجموعے: چادر صحرا، زہر آرزو، شبِ آگہی وغیرہ) جن کا ۱۹۷۴ء میں انتقال ہوگیا، اپنی مخصوص طرزِ ادا رکھتے تھے۔ غزل گوئی میں

تنوع انسانی احساسات کی عکاسی کرتے رہے، جیسے:

کاش پھولوں کو دے دے کوئی یہ سزا
ہونٹ پتھر کے ہوں اور زباں کانچ کی

نوجوانی عجیب سی شے ہے
چھاؤں میں بھی بدن سلگتا ہے

صادق نسیم (شعری مجموعہ : ریگِ رواں)، محسن احسان، توصیف تبسم، عطاشاد وغیرہ کافی عرصے سے غزلیں کہہ رہے ہیں۔ ان میں صادق نسیم اور محسن احسان نے احساس ذات کو کافی اہمیت دی ہے، لیکن زندگی کے متنوع مضامین بھی ان کی غزلوں کا موضوع بنے ہیں:

خود اپنی نگاہ سے ہوں روپوش
آئینہ ہوں جہاں نما ہوں

میں نے ہر شام یہی سوچا ہے
عمر گزری ہے کہ دن گزرا ہے
---صادق نسیم

مثال سنگ گراں راستے میں بیٹھا ہوں
مرے قریب تو آ میں بھی ایک دنیا ہوں

اس فضا میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
میں یہاں جرأت پرواز بھلا کیا کرتا

وہ درد بن کے مری روح میں اتر جائے
میں ابر بن کے کڑی دھوپ میں بچاؤں اسے
---محسن احسان

یہ آدمی ہیں کہ روتے درخت جنگل میں
ہر ایک زخم نمایاں علامتوں کے بغیر
---توصیف تبسم

ان شاعروں کے معاصرین میں انجم اعظمی (شعری مجموعے : لہو کے چراغ، لب و رخسار، چہرہ، زیرِ آسماں) محبوب خزاں (شعری مجموعہ : اکیلی بستیاں) محب عارفی (شعری مجموعے : گل آگہی، چھلنی کی پیاس) جون ایلیا، امید فاضلی (شعری مجموعہ : دریا آخر دریا ہے) محسن بھوپالی (شعری مجموعہ شکستِ شب) سحر انصاری (شعری مجموعہ : نمود) مظفر وارثی (شعری مجموعہ : موج موج تشنگی) افتخار عارف، قمر جمیل (شعری مجموعہ : خواب نما) صہبا اختر (شعری مجموعہ : سرکشیدہ) احمد ہمدانی (شعری مجموعہ : پیاسی زمین) امین راحت چغتائی، رسا چغتائی (شعری مجموعہ : ریختہ) رضی اختر شوق، رئیس فروغ، سرشار صدیقی (شعری مجموعہ :زخم گل) شبنم رومانی (شعری مجموعہ : جزیرہ) شاہد عشقی، جمیل یوسف (شعری مجموعے : موج صدا، گریزاں) حفیظ صدیقی، لیث قریشی (شعری مجموعہ :لمس گریزاں) اور عبدالعزیز خالد (شعری مجموعے : کفِ دریا، دشتِ شام وغیرہ) کافی عرصے سے غزلیں کہہ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض شاعروں نے زیادہ انفرادی اور خوشگوار اور موثر لہجے کا اظہار کیا

ہے ۔ مثلاً رضی اختر شوق موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے ایک اچھے اور منفرد شاعر ہیں ۔ ان کے کلام میں جذبات اور احساسات کی بعض نئی صورتیں اور دل فریب کیفیات ملتی ہیں، جو پائیدار بھی ہیں ۔ مثلاً :

ایک پتھر ادھر آیا ہے تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں کس کس سے شناسائی ہے

یہ میں ہوں یا ترا پرتو اتر گیا مجھ میں
یہ کون تھا جو غزل خواں گزر گیا مجھ میں

وہ آدمی کہ جو پتھر تھا جی رہا ہے ابھی
جو آئینہ تھا وہ کب کا بکھر گیا مجھ میں

ہم روح سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

میں پھر آزمائش بھی جلا ہوں
کہ دیکھو مجھ میں کتنی روشنی ہے

صد حیف کہ دیکھا ہے تجھے دھوپ سے بیکل
افسوس کہ ہم سایۂ دیوار نہیں تھے

احمد ہمدانی اور جون ایلیا کی غزلوں میں بھی دلکش اشعار ملتے ہیں ۔ ان کے موضوعات اور مضامین بالعموم عشق کی محرومیوں اور وارداتِ قلبی پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ احمد ہمدانی کے کلام میں فراق گورکھپوری کا اثر ملتا ہے، لیکن جون ایلیا کا اسلوب اور ان کے موضوعات منفرد اور مخصوص ہوتے

ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ رسا چغتائی، قمر جمیل، مرتضیٰ برلاس وغیرہ کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں، جن کی غزلوں میں متنوع کیفیات اور اسلوب کی آویزش ہے:

سلگتا ہوا دن جو کٹ بھی گیا
تو پھر آنچ دیتی ہوئی رات ہے

تھا گلہ آپ سے لیکن ہم نے
رنگ کچھ اپنا ہی اڑتا دیکھا

مرے دل میں تمناؤں کا میلہ
کسی دریا میں اک کچا گھڑا ہے

پہروں کے اس ہجوم میں لمحوں کے درمیاں
ہم اس طرح جیئے کہ بس حادثہ ہوئے

---احمد ہمدانی

ہیں صفحۂ وجود پہ سطریں کھنچی ہوئی
دیوار پڑھ رہا ہوں مگر در ہے گم یہاں

سر ہی اب پھوڑیے ندامت میں
نیند آنے لگی ہے فرقت میں

---جون ایلیا

تم ہو یا میرے شوق کا عالم
کوئی اس جان بے قرار میں ہے

یوں دل میں ترا خیال آیا
صحرا میں کھلے گلاب جیسے
---قمر جمیل

شرط غمگساری ہے ورنہ یوں تو سایہ بھی
دور دور رہتا ہے ساتھ ساتھ چلتا ہے
ترے نزدیک آکر سوچتا ہوں
میں زندہ تھا کہ اب زندہ ہوا ہوں
---رسا چغتائی

ایسا نہ ہو سحر مری بینائی چھین لے
بیداریوں سے اب مری آنکھوں میں درد ہے
بکھرا ہوا ہوں خواہش و حسرت کے درمیاں
جیسے مرا وجود ابھی فرد فرد ہے
---مرتضیٰ برلاس

شاہد عشقی، لیث قریشی، سرشار صدیقی، محبوب خزاں، رئیس فروغ اور محب عارفی وغیرہ کی غزلوں میں کئی اشعار توجہ کو اپنی طرف کھینچیے ہیں - ان شاعروں نے فکر و احساس اور جذبے کے متنوع پہلو اپنے اشعار میں بیان کیے ہیں - موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ان میں آپس میں فرق بھی ہے اور کہیں کہیں یکسانیت بھی - لیکن ایسا کم ہے کہ ان تمام شاعروں کی انفرادیت نمایاں نہ ہو سکی ہو:

بارہا یورشِ افکار نے سونے نہ دیا
فکر آزار ہے آزار نے سونے نہ دیا

عشقی ہم کوتاہ قدوں میں کوئی بھی سقراط نہیں
سچ کے گن تو سب گاتے ہیں سچ کا زہر پیے گا کون

اک زمانہ کو رکھا تیرے تعلق سے عزیز
سلسلہ دل کا بہت دور تلک جاتا ہے

---شاہد عشقی

گلیوں میں آزار بہت ہیں گھر میں دل گھبراتا ہے
ہنگامے سے سناٹے تک میرا حال تماشہ ہے

زخموں سے بچاؤں کیا بدن کو
کانٹے تو لباس میں سلے ہیں

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لیے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

---رئیس فروغ

میں اپنی آنکھوں کو اس وقت معتبر جانوں
کہ آئنیہ بھی جو دیکھوں تو تو نظر آئے

یہ التباس نظر ہے کہ اعتبار نظر
جسے بھی دیکھوں وہی ہو بہو نظر آئے

---سرشار صدیقی

ارادہ ہے کہ دنیا کو بھی دیکھیں
تجھے ہر چیز میں دیکھا بہت ہے
بکھر گئے مجھے سانچے میں ڈھالنے والے
یہاں تو ذات بھی سانچے سمیت ڈھلتی ہے
زیر لب آہ بھی محال ہوئی
درد اتنا ہنیں کہ تم سے کہیں
---محبوب خزاں

خرد یقیں کے سکوں زار کی تلاش میں ہے
یہ دھوپ سایۂ دیوار کی تلاش میں ہے
کل میں نے محب اس کو عجب طور سے دیکھا
آنکھوں نے تو کم دل نے بہت غور سے دیکھا
---محب عارفی

ان شاعروں میں رئیس فروغ اپنے دیگر معاصرین کے مقابلے میں غزل میں جدید تر اور بلکہ لایعنی رجحانات کو جگہ دینے والوں میں شامل ہیں، چناں چہ ایسے مقامات پر ان کی غزل روایتی حسن و دلکشی سے عاری ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک دو مثالیں یہ ہیں:

کل میرے لہو کی رم جھم میں
سورج کا پہیہ پھسل گیا

منڈیریوں سے صحن تک دیے جلا کے سو گئیں
کبوتروں کی جوڑیاں عجیب میہماں ہیں

انجم اعظمی اور سحر انصاری جدید ادبی رجحانات اور رویوں سے واقف ذہین اور باخبر شاعروں میں سے ہیں۔ ان دونوں کی غزلوں میں اظہار و بیان کی دلکشی اور تازگی محسوس کی جا سکتی ہے۔ مضامین میں ندرت اور تاثیر نہ ہونے کے باوجود ان کے اشعار جاذبِ توجہ ہوتے ہیں:

روز و شب ایسی کشاکش سے نہ کوئی گزرے
نہ کہیں خواب سے بچھڑے نہ غرض سے چھوٹے

کیا عجب لوگ تھے جو چھوڑ گئے صحرا میں
پتلیاں ریت میں اور خار میں دامن الجھے

---انجم اعظمی

نہ چاند میں ہے وہ چہرہ نہ سرو میں ہے وہ جسم
گیا وہ شخص تو اس کی شباہتیں بھی گئیں

ابھرتے ڈوبتے لمحات کے سمندر میں
ہوا بھی موج گریزاں ہے بادباں سے کہو

وہ پاس آئے تو موضوعِ گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو ہر گفتگو اسی سے رہے

---سحر انصاری

صہبا اختر، افتخار عارف، امید فاضلی، شبنم رومانی نے غزل کو بعض بہت خوبصورت شعر دیے ہیں - یہ سب شاعر متنوع موضوعات کے ساتھ دلکش اسلوب کے اختیار کرنے پر خاص توجہ دیتے ہیں - اور یہی ان کے فن کا نمایاں وصف ہے:

زندگی کا سفر عجیب سفر
کوئی چلتا ہو خواب میں جیسے
تجھ کو چھونے بڑھوں تو اپنے ہاتھ
پتھروں میں دبے ہوئے دیکھوں
مجھے یہ زعم کہ میں حسن کا مصور ہوں
انہیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے

---شبنم رومانی

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن
در بدر ہیں تو یاد آتا ہے
یہ دشتِ تمنا ہے قدم سوچ کے رکھنا
بڑھتا ہے سفر اور یہاں ترکِ سفر سے
بستی کا یہ عالم کہ نظر ابر کی جانب
اور ابر کا یہ حال کہ دو بوند کو ترسے

---امید فاضلی

میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہو سکے تو دعاؤں کو بے اثر کر دے
مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے
دیار نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو
---افتخارعارف

میں بھی گریز پائیِ لمحات کا شکار
تو بھی غزالِ وقت کی صورت رمیدہ ہے
دیتا ہے مجھ کو ترکِ محبت کے مشورے
تیرے سوا بھی ہے کوئی دل میں چھپا ہوا
کسی سے کیا ملوں اپنا سمجھ کر
میں اپنے واسطے بھی نارسا ہوں
---صہبااختر

ان شاعروں کے علاوہ ان کے معاصرین میں جمیل یوسف، حفیظ صدیقی، منظر ایوبی، عابد حشری، مہتاب ظفر، عالمتاب تشنہ، عبدالعزیز خالد، محسن بھوپالی، مظفر وارثی وغیرہ کے نام بھی غزل گوئی میں قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان میں سوائے عبدالعزیز خالد کے جنھوں نے دور از کار مضامین، ادق اور نامانوس الفاظ و تراکیب اور خشک اسلوب کو اپنی غزلوں میں برتا ہے، کسی شاعر

نے بہت مخصوص اور انفرادی رنگ پیش نہیں کیا۔ ان میں سے ہر شاعر نے بعض اچھے شعر کہے ہیں، لیکن ان کے سارے کلام میں ایسے اشعار کم ہیں۔ لیکن ان میں چند شاعروں نے اپنے موضوع اور اپنے اسلوب کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان میں سے بعض شاعر اپنا اپنا انفرادی لہجہ تشکیل دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور کچھ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن دراصل ابھی تک ان شاعروں نے غزل کو بہت انوکھا اور کوئی منفرد لب و لہجہ نہیں دیا۔ ویسے یہ عجیب بات ہے کہ ان شاعروں کے معاصرین میں قدرے کم عمر یا قیام پاکستان کے بعد دوسری دھائی کے آخر میں ابھرنے والے شاعروں میں انفرادی لب و لہجہ کی تشکیل کا بہت واضح رجحان اور اس ضمن میں کچھ کامیاب کوششیں نظر آتی ہیں۔ انور شعور، عبید اللہ علیم اور ناصر زیدی ان جدید غزل گو شاعروں میں سے ہیں، جنہوں نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں اپنے بہتر اور تابناک مستقبل کے امکانات ظاہر کیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان تینوں میں سے صرف انور شعور نے اب تک مستقلاً اپنے بہتر تخلیقی شعور، ندرتِ خیال و فکر کا اظہار کیا ہے اور ابھی ان کے فن میں جان اور امکانات میں کمی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن عبید اللہ علیم اور ناصر زیدی کی صلاحیتیں اب بارآور ہوتی محسوس نہیں ہوتیں۔ ان کے مقابلے میں انور شعور کی غزلوں میں زمانے کا شعور اور احساس ذات کے متنوع حقائق اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں:

تو میرے ساتھ ساتھ اگر ہے تو کیا ہوا
پھرتا ہوں کو بکو میں تجھے ڈھونڈھتا ہوا

آگ ہے اور سلگ رہی ہے حیات
راکھ ہوں اور بکھر رہا ہوں میں

بچنا ہے محال اس مرض میں
جینے کے مرض میں مبتلا ہوں

بیٹ کر جاتی ہے چڑیا فرق پر
عظمت آدم کا آئینہ ہوں میں

یہی ہو گا کہ اک دن ڈوب جاؤں گا سمندر میں
تمناؤں کی خالی سیپیاں کب تک چنوں گا میں

فقط دنیا پہ کیا الزام رکھوں
کچھ اپنے آپ میں بھی جھانکتا ہوں

کہیں تو اتنی بڑی زمیں پر کھلی ملاقات کی جگہ ہو
یہ گاؤں تو شہر ہو گئے ہیں یہ گھر تو بازار ہو گئے ہیں

ناصر زیدی (شعری مجموعے: ڈوبتے چاند کا منظر، وصال) نے ابتداء اپنے بعض اشعار سے چونکا دیا تھا۔ مثلاً ان کا ایک شعر تھا:

رکے تو چاند چلے تو ہواؤں جیسا ہے
وہ شخص دھوپ میں دیکھو تو چھاؤں جیسا ہے

لیکن ناصر اپنے خیال کی ندرت اور دلکشی کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اب اس

انداز کے بہت کم شعراء کی غزلوں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں:

وہ تیری چشم فسوں ساز تھی کہ موج کرم
وہیں وہیں پہ میں ڈوبا جہاں جہاں ٹھہری

عبیداللہ علیم (شعری مجموعہ: چاند چہرہ ستارہ آنکھیں) کے اسلوب اور خیال کی تازگی نے بھی بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ابتداءً انھوں نے کئی اچھے شعر کہے، جن میں ندرت اور احساس الم کی پر تاثیر کیفیتیں تھیں، لیکن اب ایسی خصوصیتیں ان کے کلام میں کم نظر آتی ہیں۔ ان کے چند نمائندہ شعر یہ ہیں:

بنا گلاب تو کانٹے چُبھا گیا اک شخص
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص

میں کس ہوا میں اڑوں کس فضا میں لہراؤں
دکھوں کے جال ہر اک سو بچھا گیا اک شخص

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

تو بوئے گل ہے اور پریشاں ہوا ہوں میں
دونوں ہیں ایک رشتۂ آوارگی تو ہے

عزیز اتنا ہی رکھو کہ دل سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

اب ترے ہجر میں لذت نہ ترے وصل میں لطف

ان دنوں زیست ہے ٹھہرے ہوئے آنسو کی طرح

ان شاعروں کے ساتھ ساتھ متعدد ایسے غزل گو ہیں جو مختلف رجحانات کے حامل رہے ۔ ویسے عصری آگہی، سماجی شعور اور جدید علوم سے واقفیت کے سبب اس دور میں نمایاں ہونے والے شاعر اپنے زیادہ وسیع ماحول میں مشاہدات کی گہرائی و گیرائی، احساسات کی بوقلمونی اور حقائق کی دریافت کے مختلف مراحل سے گزرے اور اس طرح ان کی شاعری میں فرد اور معاشرے کے روابط کے بعض نئے پہلو اور اثر اندازی اور اثر پذیری کی کچھ نئی کیفیات شامل ہوئیں ۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے کی نسل قیام پاکستان کے بعد قریبی عرصے میں ابھرنے والی نسل سے اور پھر ناصر کاظمی اور باقی صدیقی کی نسل احمد فراز، شکیب جلالی اور منیر نیازی کی نسل سے رجحانات اور اسلوب کے لحاظ سے قدرے فاصلے پر رہی ہے ۔ اس سے قطع نظر کہ ان تمام ادوار میں جذبات و احساسات اور اسلوب کے مشترک پہلو ہر دور میں موجود رہے ہیں، لیکن پھر بھی زمانہ اس قدر تیزی سے بدل رہا ہے کہ فکر و خیال اور اسلوب و فن کے تقاضے ہر دس سال کے عرصے میں نئی تبدیلیوں اور نئی ضرورتوں کا پتہ دیتے ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد کئی شاعرات بھی غزل گوئی میں نامور ہوئیں اور ن میں سے بعض نے اچھی غزلیں اور عمدہ اشعار لکھنے کے سبب امتیاز بھی

حاصل کیا۔ لیکن ایسی شاعرات کی تعداد کم رہی ہے جو غزل میں بہت منفرد اور اپنا مخصوص اسلوب پیش کر سکی ہیں۔ ادا جعفری (شعری مجموعے: میں ساز ڈھونڈتی رہی، غزالاں تم تو واقف ہو، شہر درد) قیام پاکستان کے آس پاس کے دور میں ابھرنے والی نمائندہ شاعرہ ہیں اور ابھی تک یہ مستقل مزاجی کے ساتھ غزلیں کہہ رہی ہیں اور بہر حال غزل سے فطری مناسبت بھی رکھتی ہیں۔ ان کی غزلیں گہرائی اور عصری آگہی دونوں کو ظاہر کرتی ہیں، لیکن اس کے باوجود غزل گوئی کی عام دنیا میں ان کی کوئی انفرادیت نمایاں نہ ہو سکی۔ ویسے ان کے بعض اشعار پر نظر جم جاتی ہے:

راہوں میں کوئی آبلہ پا اب نہیں ملتا
رستہ میں مگر قافلہ سالار بہت ہیں

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اک آشنا سی لو
سوچو تو آس پاس کوئی راز داں نہیں

چاروں طرف تھی ریت بہت تیز تھی ہوا
دل میں چھپا لیے ہیں تمھارے نقوش پا

سفر تمام ہوا اور حسرتیں نہ گئیں
جو قربتیں تھیں وہاں فاصلہ بلا کا تھا

ان کی ہمعصر شاعرات میں وحیدہ نسیم اور سعیدہ عروج مظہر بھی روایتی اسلوب کے ساتھ غزلیں لکھتی رہی ہیں۔ وحیدہ نسیم کی شاعری کا ایک مجموعہ "موج نسیم" ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا، لیکن سعیدہ عروج کا کوئی شعری

مجموعہ ان کے انتقال ۱۹۷۷ء اور اس کے بعد بھی شائع نہیں ہو سکا۔ ان کے مقابلے میں زہرا نگاہ (شعری مجموعہ : شام کا پہلا تارہ) کشور ناہید (شعری مجموعے : گلیاں دھوپ اور دروازے، بے نام مسافت، لبِ گویا) عرفانہ عزیز (شعری مجموعہ : برگِ ریز) اور پروین فنا سید (شعری مجموعہ : حرفِ وفا) جدید رجحانات کی حامل شاعرات ہیں۔ ان میں سے عرفانہ عزیز اور پروین فنا سید اب بہت کم غزلیں لکھتی ہیں اور محض چند اچھے شعروں سے زیادہ ان کا عروج نہ ہو سکا۔ لیکن کشور ناہید نے ان دونوں کے برعکس ایک انفرادیت اور ایک جاذبِ نظر رنگ اپنی غزلوں میں پیدا کر لیا ہے۔ ان کی شاعری زیادہ تر جذبات اور احساسات اور فی الواقعہ نسوانی جذبات اور لہجے کی شاعری ہے۔ یہ انداز اور یہ لب و لہجہ قیام پاکستان کے بعد ابتدأً انہی کی غزل میں ملتا ہے اور اس اعتبار سے یہ یہاں اس کی موجد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری جدید شاعری میں اس رجحان کی نمائندہ بھی ہے جو جدید افکار و خیالات اور تہذیبی اقدار کی تبدیلیوں، آزادیٔ نسواں اور جذبات کے بلا روک ٹوک اظہار کے رویوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک طرح کا جذباتی ابال ہے جو معاشرتی اقدار اور روایات سے انحراف اور ردِ عمل کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔ اس میلان نے بعض شاعرات کی، جن میں خود کشور ناہید اور پھر فہمیدہ ریاض، پروین شاکر وغیرہ شامل ہیں، بالخصوص نظموں میں زیادہ واضح صورت اختیار کی ہے۔ غزلوں میں یہ باتیں ابھی زیادہ واضح نہیں ہیں اور فی الحال یہ اشاروں کنایوں اور محبوب کے لیے صیغۂ تذکیر کے استعمال تک محدود ہیں۔ ممکن ہے یہ

صورتِ حال موجودہ جذباتی ابال کے ختم پر تبدیل ہو جائے اور مثبت اور شائستہ اظہار کے حدود میں آجائے۔

کشور ناہید نے بہر حال غزل کو اپنا مخصوص رنگ اور لب و لہجہ دیا ہے جو اگر پائیدار رہ جائے اور ان کا جذباتی ابال کچھ کم ہو تو ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر یہ ممکن ہے کہ شاعری کو کچھ زیادہ اچھی چیزیں مل جائیں۔ ان کے چند نمائندہ شعر دیکھیے:

کنویں بھی ختم ہوئے پنگھٹوں کا دور گیا
یہی سبب ہے کوئی تہہ میں جھانکتا نہ ملا

تمھارے شہر کے لڑکوں کو کیا ہوا ناہید
بہت اداس ملے کوئی دل دکھا نہ ملا

کچھ یوں ہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

واقف نہیں ہوں شکل سے اطوار سے مگر
لگتا ہے اس کا نام ہی اکثر بھلا مجھے

ان کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں بعض بہت تابناک شعر بھی ملتے ہیں۔ جیسے:

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشہ کو
اس آئینہ میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

بند ہوں در تو یہ دیوار گرا ڈالے گا
دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہے

مرا وجود بھی کیا کچھ خدا سے ملتا ہے
سوال و شک سے ہے بیگانہ میری ہستی کیوں

کشور ناہید کے علاوہ فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کی شاعری بھی عورت کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے غزلیں بہت کم اور نظمیں زیادہ لکھیں، لیکن ان کی نظموں میں بھی تغزل کی کمی نہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی غزلیں کوئی انفرادیت نہیں رکھتیں۔ جدید شاعرات میں اگر غزل کو کسی نے انفرادی لب و لہجہ دیا اور کمسنی کے نسوانی جذبات کو شاعری کی زبان دی تو اس لحاظ سے پروین شاکر (شعری مجموعے: خوشبو، صد برگ) نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے نظم نگاری اور غزل گوئی دونوں میں یکساں دلچسپی لی ہے اور تغزل دونوں اصناف میں بہت نمایاں ہے، لیکن پھر بھی ان کی غزلیں زیادہ دلکش اور جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔ انھوں نے غزل کو کوئی بہت انفرادی اسلوب اور لب و لہجہ تو نہ دیا لیکن لطیف جذبات، نسوانی احساسات اور نازک خیالی ان کی غزلوں کی مخصوص صفات ہیں۔ ان کے معاصر شاعروں میں بہت کم شاعر ایسے ہیں جنھوں نے محبت کے فرسودہ موضوع پر ان کی طرح دلکش اور اچھوتے مضامین کو شعر کا روپ دیا ہے۔ اسلوب سادہ اور دلنشیں ہے، لیکن کہیں کہیں روانی اور ترنم میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے چند منتخب شعر یہ ہیں:

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحہ
جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی

دھنک کے رنگ میں ساری تو رنگ لی میں نے
اور اب یہ دکھ کہ پہن کے کسے دکھانا ہوا

اس قسم کی مثالیں "خوشبو" میں بکثرت ملتی ہیں ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ پروین شاکر نے اپنے اس پہلے شعری مجموعہ میں اپنی جن صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا وہ ان کے دوسرے شعری مجموعے "صد برگ" میں اس طرح پر نظر نہیں آتیں ۔ خیالات اور جذبات میں تازگی اور نکھار تو ہے لیکن اب اس میں ندرت اور دلکشی کی کیفیت کم ہے ۔ بلکہ اس لحاظ سے اگر مقابلہ کیا جائے تو "خوشبو"

کے مقابلے میں ان کی شاعری "صدِ برگ" میں زوال پذیر ہوئی ہے۔

پروین شاکر کی معاصر شاعرات میں جن شاعرات کو توجہ اور شہرت حاصل ہوئی ان میں شاہدہ حسن اور ارشاد ارشی خصوصیت رکھتی ہیں۔ ان شاعرات نے بعض خوبصورت شعر ضرور تخلیق کیے، لیکن ایسی مثالیں ان کی غزلوں میں زیادہ نہیں ملتی اور ابھی ان میں سے کسی کا اپنا مخصوص رنگ نمایاں نہیں ہوا ہے۔ اب تک جو غزلیں انھوں نے لکھی ہیں۔ ان میں چند اچھے شعر مل جاتے ہیں:

برستی رہتی ہے وحشت سی بام و در سے ترے
گئی ہے جب سے کھنک چوڑیوں کی گھر سے ترے

ڈھلی جو شام بہت مضطرب ہوئے ارشی
کہ منتظر سے تھے کچھ لوگ جو سحر سے ترے

یہ دھڑکنیں نئے معنی تلاش کر لیں گی
اگرچہ دل کے فسانے کہے سنے ہیں بہت

---ارشاد ارشی

دیواروں پر سارے سائے بوجھل ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ موسم جل تھل ہیں

میں نے ان سب چڑیوں کے پر کاٹ دیے
جن کو اپنے اندر اڑتے دیکھا تھا

---شاہدہ حسن

## امکانات کے شاعر

قیام پاکستان کے بیس یا پچیس سالوں کے بعد ابھرنے والے شاعروں میں (جو اگرچہ نو عمر نہ بھی ہوں تو بھی) نو عمر اور نئی نسل کے شاعر کہے جاتے ہیں۔ بعض شاعر مستقبل کے بہتر امکانات کا پتہ دیتے ہیں۔ ان شاعروں کو اپنے بزرگ معاصرین سے ورثہ اور اثر پذیری میں عصری مسائل، فرد اور معاشرے کے روابط، مظاہر فطرت، انفرادی اور اجتماعی علامتوں اور فنی لوازم کا گہرا شعور ملا ہے۔ چناں چہ جن مراحل کو ان سے قبل کے شاعروں نے ایک طویل عرصے میں طے کیا تھا، اس نسل نے بہت جلد ان تک رسائی حاصل کرلی۔ اس لحاظ سے ان شاعروں کی بعض ابتدائی شعری کاوشیں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہیں اور ان سے ان کے بہتر مستقبل کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے کے شاعروں میں ثروت حسین، راشد مفتی، ریاض مجید، شریف منور، حسن اکبر کمال، سرمد صہبائی، سلیم کوثر خورشید رضوی، امجد اسلام امجد، کیف انصاری، صابر ظفر، راغب شکیب، عطاء الحق قاسمی: انور محمود خالد، شبی فاروقی، خالد احمد، جلیل عالی، جاذب قریشی، پیرزادہ قاسم، اجمل نیازی، سلیم بیتاب، جمال احسانی، بشیر سیفی، پاشار حمان، زہیر کنجاہی، سلطان رشک، نصیر ترابی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے بعض شاعر شعری دنیا میں اپنی عمدہ صلاحیتوں کا اظہار کر چکے ہیں۔ چند شاعروں کے شعری مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ یا یہ سب ہی نام متعدد ادبی رسالوں کے گوشہ غزل میں عام طور پر دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ ان تمام شاعروں میں تغزل اور تفکر کی

خصوصیات بھی ہیں اور غزل کے روایتی مضامین اور روایتی زبان کے بجائے اپنی زندگی اور اپنے ماحول سے موضوعات اخذ کرنے اور فطری زبان کے انتخاب کی کوششوں کا انداز بھی ہے - ان میں سے بعض شاعروں کی غزلوں میں نہ صرف نئے موضوعات و مشاہدات یا نئے تجربات نئے لب و لہجہ کے ساتھ ملتے ہیں بلکہ ان کی خود ایجاد کردہ زمین بھی ملتی ہیں - ان میں سے بعض شاعروں کے نمائندہ اشعار دیکھیے :

گندم اور گلابوں جیسے خواب شکستہ کرتے
دور دراز زمینوں والے شہر میں در آتے ہیں
یوں تو ہر شخص کو مخلص پایا
ویسے ہر ہاتھ میں پتھر دیکھا
ایک اڑتے ہوئے پتے کی طرح
خود کو لمحات کی زد پر دیکھا
---ثروت حسین

ہر ایک شخص سمٹتا ہوا دکھائی دیا
تمام شہر بکھرتا ہوا نظر آیا
---جمال احسانی

ہم اہل ہجر کو صحرا میں ایک رستہ تھا
اب اس طرف سے بھی خلق خدا گزرتی ہے
---نصیر ترابی

ہجوم حشر کا نقشہ دکھائی دیتا ہے
ہر ایک شخص اکیلا دکھائی دیتا ہے
---بشیر سیفی

بستی میں کس عذاب کے ڈر جاگنے لگے
شب بھر پس فصیل بھی گھر جاگنے لگے

لا نہ سکتا تھا جسے کوئی لب اظہار پر
جا بجا لکھا گیا وہ شہر کی دیوار پر

اپنے دیئے کو چاند بتانے کے واسطے
بستی کا ہر چراغ بجھانہ پڑا ہمیں
---جلیل عالی

اس ملک میں بھی لوگ قیامت کے ہیں منکر
جس ملک کے ہر شہر میں اک حشر بپا ہے

شہروں کی خاک چھان کر آیا ہوں گاؤں میں
کتنا سکون ملا ہے درختوں کی چھاؤں میں
---سلیم بیتاب

جب دن چڑھا ہزارہا کاموں میں بٹ گئے
رات آ گئی تو اپنے ہی اندر سمٹ گئے

اس سے کب دیکھی گئی تھی میرے رخ کی مردنی
پھیر لیتا تھا وہ منہ مجھ کو دوا دیتے ہوئے
---ریاض مجید

دو حرف تسلی کے جس نے بھی کہے اس کو
افسانہ سنا ڈالا تصویر دکھا ڈالی
پھوڑ لیں سر بھی تو دنیا کا معما نہ کھلے
جیسے دیوار پہ تصویر ہو دروازے کی
---خورشید رضوی

کوئی جی اٹھتا ہے مجھ میں ہر روز
روز مجھ میں کوئی مر جاتا ہے
جب بھی مر جاتا ہے مفلس کسی کنبہ کا کفیل
ایک کے ساتھ کئی اور بھی مر جاتے ہیں
آب و ہوا تو آ نہ سکی اختیار میں
کاغذ کے پھول ہم نے سجائے بہار میں
شام تک اپنے منتظر تھے ہم
صبح تک تیرا انتظار رہا
---شریف منور

جب وہ آسیب زدہ دشت سے گزرا تو لگا
جیسے نوخیز سی بیوہ کا ہے آنچل دریا
مقابل آئینہ ہے سوچتا ہوں
یہ چہرہ تو مرا چہرہ نہیں ہے
---پاشارحمان

تم تو آئینے والے تھے عکس مل گیا ہو گا
میں صدا کا بے چہرہ میرا آئینہ ہی کیا

---سلیم کوثر

اتنا احسان اور کرتا کون
مجھ سے بڑھ کر مجھے سمجھتا کون

---شبی فاروقی

مجھے پتہ بھی نہ تھا مجھ میں ہے نہاں کیا کیا
تمھارے درد نے جوہر کیے عیاں کیا کیا

کون سی منزل پہ لے آئی اکائی ذات کی
ٹوٹ جاؤں گا اگر میں نے کسی سے بات کی

---امجد اسلام امجد

کل یہی بچے سمندر کو مقابل پائیں گے
آج تیراتے ہیں جو کاغذ کی ننھی کشتیاں

---حسن اکبر کمال

آنکھوں میں ہے نیلی رات سمندر کی
اس کے اندر چاند ہے تیرے سپنے کا

---سرمد صہبائی

کوئی انسان تو مکمل ہوتا
کہیں سودا کہیں سر چھوٹا ہے

میں وہاں بھی کنج خلوت کو ترس ترس گیا ہوں

کہ جہاں مرے علاوہ کوئی دوسرا ہنیں ہے

---راشد مفتی

جس طرف جائے مہک چھوڑ آئے

رنگ خوشبو میں تمہارے نکلے

ساتھ چلتے ہیں مگر دوری پر

لوگ دریا کے کنارے نکلے

---خالد احمد

اوپر دی ہوئی مثالوں کو پاکستان کی موجودہ غزل گوئی کا ایک نمائندہ اظہار کہا جاسکتا ہے۔ نوجوان نسل اور وہ نسل جو قیام پاکستان کے بعد ابھری، دونوں کی غزل گوئی کے موضوعات و مضامین، افکار، میلانات، تجربات اور رجحانات و اسالیب میں مجموعی طور پر رنگ و آہنگ کے لحاظ سے وہی فرق محسوس ہوتا ہے جو خود پاکستان کے معاشرے میں تبدیلیوں اور نشیب و فراز کی صورت میں سامنے آتا رہا ہے۔ پاکستان میں جو غزل لکھی جاتی رہی ہے اگر تمام پہلوؤں سے بنظر غائر دیکھا جائے تو اس میں پاکستانی معاشرے کے تمام خط و خال کہیں نمایاں اور کہیں ڈھکے چھپے انداز میں نظر آجائیں گے۔ اسی لحاظ سے اگر پاکستان میں لکھی جانے والی غزل کا بھارت میں لکھی جانے والی غزل سے اس کے مزاج کے اعتبار سے مقابلہ کیا جائے تو دونوں میں فرق بہرحال محسوس ہوگا اور یہ فرق دونوں ممالک کے معاشروں کے فرق کے لحاظ سے

سامنے آئے گا - یہ حقیقیت بھی سامنے آئے گی کہ پاکستان کا معاشرہ قیام پاکستان سے اب تک مستقل طور پر انتشار، بحران اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دو چار ہوتا رہا ہے - ابھی یہاں کی تہذیب و ثقافت کا کوئی خاص رخ اس کے معاشرہ کی مناسبت سے متعین نہیں ہو سکا ہے، جس پر اس کا سفر جاری رہ سکے - چناں چہ یہاں کی غزل کو جس انتشار اور بحران کی فضا میں جنم لینا پڑا ہے وہ بھارت میں اس صورت میں موجود نہیں ہے - لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عمدہ غزل کی تخلیق کے لیے جس قسم کی فضا درکار ہوتی ہے وہ پاکستان میں مل جانے کے سبب اسے پر تاثیر لب و لہجہ اور قلب و ذہن کی صداقتوں کی صورت میں حاصل ہوئی ہے - یہی وجہ ہے کہ ایک عام تاثر کے مطابق پاکستان کی غزل بھارت کی غزل کے مقابلے میں زیادہ جاذبیت اور اثر رکھتی ہے - پھر ایک بڑا فرق یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ چوں کہ پاکستانی معاشرہ بھارت کے مقابلے میں تہذیب و ثقافت اور طرزِ معاشرت میں مغرب سے روابط اور اثر پذیری میں زیادہ تیز رفتاری کا ثبوت دے رہا ہے، اس لیے یہاں کی غزل میں روایتوں اور اقدار کے بجائے حقائق اور زندگی کے معروضی پہلوؤں نے زیادہ اہمیت اور توجہ حاصل کر لی ہے - اسی کے ساتھ ساتھ موضوعات میں زیادہ تنوع اور زیادہ ہمہ گیری آگئی ہے اور فنی رویوں کے لحاظ سے موجودہ عہد کے شعرا غیر ضروری الفاظ، تکرار اور وضاحت سے احتراز کرتے ہیں اور ایجاز و اختصار اور سادگی و سلاست پر زور دیا جاتا ہے -

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں غزل کی رفتار اور ترقی کے پیش نظر یہ کہا

جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی تخلیقی صفات اور خصوصیات کو نمایاں کر کے اپنی زندگی اور اپنی توانائی کا ثبوت فراہم کیا ہے - یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہم انفرادی اور اجتماعی احساسات، فرد اور ماحول کا ذہنی رویہ اور فنی رجحان دیکھ سکتے ہیں - اس نے حالات اور معاشرہ اور انسان کے انتشار، کرب، امید و بیم، نشیب و فراز اور ارتقا کی عکاسی کی ہے - یہ عمل جاری ہے اور غزل کے معنوی امکانات کی بتدریج توسیع ہو رہی ہے -

# اسی مصنف کی چند مطبوعات

## تصنیفات:

امیر خسرو: فرد اور تاریخ (کراچی)
نوادراتِ ادب، (لاہور)
پاکستان میں اردو ادب، محرکات اور رجحانات کا تشکیلی دور (کراچی)
اقبال اور جدید دنیائے اسلام؛ مسائل، افکار اور تحریکات (لاہور)
تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ (کراچی)
پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار (کراچی)
پاکستان میں اردو غزل [رانچی (بھارت)]
سلطنتِ بہمنیہ اور ایران کے علمی و تمدنی روابط (کراچی)
تحریکِ آزادی اور مملکتِ حیدر آباد (کراچی)
تحریکِ پاکستان کا تعلیمی پس منظر (لاہور)
مسلمانوں کی جدو جہد آزادی؛ مسائل، افکار اور تحریکات (لاہور)
تحریکِ پاکستان اور مولانا مودودی (کراچی)

## تالیفات

کلام رنجور: رنجور عظیم آبادی کے کلام کی اولین اشاعت (پٹنہ، بھارت)
بیتی کہانی: اردو کی اولین نسوانی خود نوشت (حیدر آباد، سندھ)
مدح و قدح دکن: ادب و شعر میں تاریخ و تمدن دکن کی جھلکیاں (کراچی)
دکن کا عہدِ اسلامی: ایک منتخب کتابیات (کراچی)
کلام نیرنگ: میر غلام بھیک نیرنگ اور ان کا کلام (کراچی)
ایک نادر سفر نامہ: دکن کے اہم مقامات کے احوال و کوائف (کراچی)
اشاریہ، کلام فیض: (کراچی و دہلی)
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ایک کتابیات (اسلام آباد)
"منتخبات اخبار اردو" (اسلام آباد)
"منتخبات اردو نامہ" (اسلام آباد)